انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جمادی الثانی۔رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ/اپریل۔جون ۲۰۱۵ء شمارہ:۲، جلد:۲۹،

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی ....علی گڑھ

سید راشد حامدی فلاحی ...... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ :	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون :	اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ :	اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور

ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی

شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

+91-9891051676

abulaalasubhani@gmail.com

برائے انتظامی امور وترسیل زر

سید راشد حامدی فلاحی

شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

+91-9811126467

s.rashidhamidi@gmail.com

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۳
میری آنکھیں کھول دیں!	عبدالرب کریمی فلاحی	۵
ہمارے زمانے کا جامعہ	نسیم احمد غازی فلاحی	۸
آزادیٔ رائے کی اہمیت اور اس کے لیے ماحول سازی میں علماء کا کردار	شبیر احمد فلاحی	۲۲
	رضوان احمد فلاحی	۲۵
	پروفیسر اشتیاق دانش	۲۷
	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی	۳۰
	شمشاد حسین فلاحی	۳۳
	ڈاکٹر محی الدین غازی	۳۴
	اشتیاق عالم فلاحی	۳۶
	سدید ازہر فلاحی	۳۸
	عمار جاوید القصوری	۴۱
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۸)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۴۴
صبا نے پھر درِ مطبخ پہ---	ڈاکٹر امتیاز وحید	۵۴
شعر و نغمہ	سید راشد حامدی فلاحی، اختر عظیم آفاقی فلاحی مرحوم، سالم سلیم، ڈاکٹر عبدالرشید راشد، محمد صادق ظلی فلاحی (خلاد اعظمی)، ضمیر اعظمی فلاحی	۶۸
تعارف و تبصرہ	سالم سلیم، محمد صادق ظلی فلاحی	۷۳
آپ کے خطوط	قارئین	۷۷
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۸۸
اخبار انجمن	ادارہ	۹۲

اداریہ

اپنی بات

امت مسلمہ جدید دور میں عالمی سطح پر جن بڑے چیلنجز سے دوچار ہے ان میں سرفہرست فکری بحران ہے۔عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے یہ فکری بحران یقیناً ایک بڑا چیلنج ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے امت کی مجموعی صورتحال پر کافی گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

امت مسلمہ زمان ومکان کے حدود وقیود سے آزاد ایک نظریاتی امت ہے،جس کی کچھ فکری اور نظریاتی بنیادیں ہیں اور انہی بنیادوں پر اس کو تبدیل ہوتے حالات اور زمانے میں اپنا سفر آگے بڑھانا ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو امت کے فکری اور عملی محاذ میں یک گونہ ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔فکر سے آزاد عملی پیش رفت کا یہاں کوئی تصور نہیں۔

امت کے مزاج، اس کی ابتدائی تاریخ اور بنیادی لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ترکیب کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے یہاں کسی بھی سطح پر اور کسی بھی مقام پر ٹھہراؤ اور جمود کا تصور ہی نہیں ہے۔ ہر آن ایک نئی دنیا کی تلاش اور موجود کو بہتر سے بہتر میں تبدیل کر دینے کی جدوجہد اس کے مزاج میں داخل ہے۔ چنانچہ ابتدائی تاریخ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امت اور افراد امت اس مزاج سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ بہت ہی کم مدت میں انہوں نے دنیا بھر میں اپنے افکار ونظریات کو نہ صرف متعارف کرانے میں کامیابی حاصل کی، بلکہ ان کی بنیاد پر ایک نیا عالمی نظام بھی تشکیل دیا۔

رفتہ رفتہ امت اور افراد امت کا اپنی فکری ونظریاتی بنیادوں سے رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا، اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج اور سوچ میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی اور وہ حرکت وانقلاب کے بجائے ٹھہراؤ اور جمود سے مانوس ہوتے چلے گئے۔

یہ فکری بحران امت پر باہر سے مسلط کردہ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ افراد امت کی اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے، یقیناً اس فکری بحران یا اس بحران کے نتیجے میں امت کی موجودہ صورتحال کے لیے کسی بھی درجہ میں اسلام اور اسلامی تعلیمات ذمہ دار نہیں ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت مسلمہ کے فکری بحران کو لے کر امت کا ذہین طبقہ ہمیشہ سے فکرمند رہا ہے، قریبی زمانے میں برصغیر کے اندر شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ

حمید الدین فراہیؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ وغیرہم کی جدوجہد اور ان کا تحریری سرمایہ اس کی روشن دلیل ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب بھی امت کو موجودہ فکری بحران سے نکالنے کے لیے کسی نے روایتی طرز فکر سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے، خواہ یہ کوشش قرآن وسنت اور ان کی روح اور مقاصد سے کتنی ہی مطابقت رکھتی ہو، اس کو اپنے ہی لوگوں کی سخت ترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

امت مسلمہ کے فکری بحران پر گفتگو کے لیے لازمی ہے کہ غیر معمولی حد تک علمی وفکری تیاری پر توجہ دی جائے۔ بیشتر اوقات فکری بحران کے ازالے پر گفتگو کرنے والوں کی سطحی اور غیر علمی گفتگو اس میدان میں واقعتاً کام کرنے والوں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

امت کے فکری بحران پر گفتگو کے دوران عموماً ایک قسم کی ردّعمل کی نفسیات غالب رہتی ہے۔ حقیقی اسباب، واقعی نتائج اور مطلوبہ لائحہ عمل پر ٹھوس اور مضبوط گفتگو کی جگہ شکایات اور الزامات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، اور بات آگے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو موجودہ صورتحال کا ذمہ دار ٹھہرایا جانے لگتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام کوششیں ردّعمل اور جوابی ردّعمل کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں، اور پھر اس بحرانی کیفیت کے خاتمے کے بجائے اس میں مزید اضافے کا سبب بن جاتی ہیں۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے وقت یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام آج بھی جوں کا توں محفوظ ہے، اور اسلام کی تصویر آج بھی بالکل صاف ہے، اور نفس اسلام میں نہ تو کبھی کسی تبدیلی اور کمی بیشی کا امکان اور جواز تھا اور نہ ہی آج ہے۔ مسئلہ صرف اور صرف ان تشریحات اور تعبیرات کا ہے جو مختلف ادوار میں مختلف مسلم اسکالرس کی جانب سے سامنے آئی ہیں، جس میں صحت اور عدم صحت دونوں کا امکان ہے۔

اس سلسلے میں آزادیٔ رائے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ تازہ شمارے میں اس کی اہمیت، ضرورت اور اس کے لیے ماحول سازی میں علماء کے کردار پر اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ یقیناً یہ امت کے فکری بحران کے ازالے کے لیے کی جانے والی جدوجہد کی بنیادی اور اولین ضرورت ہے کہ سوچنے سمجھنے اور پھر اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار کرنے کا عام ماحول بنایا جائے۔

ضرورت ہے کہ امت کے فکری بحران پر اس پہلو سے ٹھوس اور سنجیدہ کام کیا جائے کہ اس کے حقیقی اسباب کیا ہیں، اور کیا منفی اثرات ہیں جو اس فکری بحران کی وجہ سے امت کی مجموعی صورتحال پر مرتب ہوئے ہیں، اور پھر اس صورتحال سے نکلنے کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں موجودہ حالات میں کیا لائحہ عمل ہو سکتا ہے جس پر امت کو مطمئن اور یکجا کیا جا سکے۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

میری آنکھیں کھول دیں!

عبدالرب کریمی فلاحی، شعبہ دعوت، مرکز جماعت اسلامی ہند
موبائیل نمبر:09818869018

مارچ ۲۰۰۸ء کی بات ہے بنگلور سے دہلی سفر کے دوران ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ وطنی بھائی (ستیش شرما) سے ملاقات ہوئی، قریب چالیس گھنٹوں کا سفر ان کے ساتھ کرنے کا موقع ملا، موصوف بریلی (یوپی) کے رہنے والے تھے، شریف النفس اور خلیق تھے، پیشہ سے ڈاکٹر (سرجن) تھے، ٹرین چلنے کے تھوڑی دیر بعد انہوں نے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے اپنا تعارف کرایا، جب میں نے اپنا نام بتایا تو بہت خوش ہوئے، کہنے لگے اب سفر اچھا رہے گا، اس لیے کہ ہمارے ساتھ چھوٹا بھارت سفر کر رہا ہے، واضح رہے کہ ہمارے کیبن میں ایک سکھ بھی تھے۔

ڈاکٹر شرما مسلم تہذیب اور رسوم ورواج سے کسی حد تک واقف تھے، کہنے لگے کہ ان کے بہت سارے دوست مسلمان ہیں جن کے یہاں ان کا آنا جانا ہوتا ہے، لیکن افسوس کہ اسلام کے بارے میں ان کی معلومات بالکل صفر تھیں، جب میں نے ٹرین میں نماز پڑھی تو انہیں حیرت ہوئی، کہنے لگے کیا سفر میں بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ میں نے انہیں نماز، اذان اور دیگر عبادات کے بارے میں مختصراً بتایا، بات یہاں سے آگے بڑھی تو کہنے لگے کہ اسلام میں عبادات کا نظام بہت سخت ہے، شدید گرمی میں روزہ رکھنا، دن میں پانچ بار نماز پڑھنا وغیرہ، جبکہ ہندو دھرم عبادت اور پوجا کو آسان بنا کر پیش کرتا ہے۔ دوران گفتگو انہوں نے کئی بار اسلام اور قرآن کو مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی کتاب کہا، میں نے ان سے عرض کیا کہ اسلام صرف مسلمانوں کا مذہب نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے اسی طرح قرآن بھی سب کے لئے ہے، قرآن پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، قرآن انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا ہے۔

دورانِ سفر ٹرین ایسی جگہ سے گزر رہی تھی جہاں سے شیرڈی کے سائیں بابا کا مندر قریب تھا، ٹرین میں سائیں بابا کے کئی بھگت (مرید) تھے، ڈاکٹر شرما نے بتایا کہ وہ بھی بابا کے معتقد ہیں، ہزاروں لوگ روز

درشن کے لئے آتے ہیں۔شاید میری اور سردار جی کی رعایت رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مہاپرشوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے، بھارت صوفی سنتوں کا دیش ہے، یہاں گرونانک، خواجہ اجمیری اور سائیں بابا جیسے مہان لوگوں نے جنم لیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ یہ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان مہاپرشوں کے ساتھ ظلم ہے، ان لوگوں نے تو صرف ایک ایشور (اللہ) کی پوجا کی اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا، لیکن ان کے بھگتوں اور مریدوں نے انہیں کو معبود بنالیا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لوگ ان کی تعلیمات کی پیروی کرتے۔

موقع مناسب تھا میں نے اختصار کے ساتھ ڈاکٹر شرما اور دوسرے رفقائے سفر کے سامنے اسلام کا تصور توحید پیش کیا، اور یہ بھی بتایا کہ ایشور نے اپنی مرضی بتانے کے لئے ہر زمانے اور قوم میں اپنے دُوت (پیغمبر) بھیجے، جنہوں نے انسانوں کو اللہ کی مرضی نہ صرف بتائی بلکہ اس پر چل کر دکھایا، تصور رسالت پر جیسے ہی گفتگو آگے بڑھی ڈاکٹر شرما نے اوتار واد کی بحث چھیڑ دی۔ میں نے اپنے علم کی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی، انہیں بتایا کہ ایشور دنیا والوں کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے زمین پر خود نہیں اترا، بلکہ اس نے اپنے نیک بندوں کو بھیجا جنہیں ہم دُوت، پیغمبر، رسول اور پرافٹ کہتے ہیں۔ دنیا کے پہلے آدمی اور پیغمبر حضرت آدم سے لے کر آج تک سب کا دھرم اور مذہب ایک ہی رہا ہے۔ الگ الگ ملکوں میں الگ الگ مذاہب اور دھرم نہیں آئے، بات آگے بڑھی تو ڈاکٹر شرما نے گوتم بدھ، رام اور کرشن کے بارے میں سوال کیا کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ بھارت میں ایشور کے دُوت ہیں، میں نے ان سے کہا کہ بھارت ایک قدیم ملک ہے، اس کی تہذیب اور تاریخ بھی بہت قدیم ہے، یقیناً یہاں بھی ایشور کے دُوت آئے ہوں گے، وہ کون ہیں، کہاں اور کب آئے، اس کی جانکاری نہ ہمیں ہے اور نہ آپ کو ہوگی، اس لئے ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ دوسرے مذاہب کی محترم شخصیات کی توہین کی جائے یا انہیں بُرا بھلا کہا جائے۔

اسلام کے عائلی سسٹم، پردہ، عورتوں کی سماجی صورت حال، نکاح وطلاق جیسے موضوعات پر بھی باتیں ہوئیں، ان کی ہر بات غلط فہمی پر مبنی تھی، اتراکھنڈ چمولی کے ایک ہم سفر نے کہا کہ مسلمان چار شادیاں کیوں کرتے ہیں، میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ ایسے کتنے مسلمانوں کو جانتے ہیں جنہوں نے ایک سے زائد دو تین یا چار شادیاں کی ہیں، ان کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے انہیں ہندی رسالہ ''مایا'' کی ایک سروے رپورٹ کا حوالہ دیا جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک سے زائد شادیوں کا رواج مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں پایا جاتا ہے، مسلمانوں پر ایک سے زائد شادیاں کرنا سراسر الزام ہے جس کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شرما اور دیگر لوگوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کے عائلی قوانین کے بابت

وطنی بھائیوں کو کس قدر غلط فہمیاں ہیں۔ میں نے ان حضرات سے یہ بھی معلوم کیا کہ آپ میں سے کتنے بھائیوں نے اسلام اور قرآن کے بارے میں اصل ریسورس سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب کا جواب نفی میں تھا، البتہ ڈاکٹر شرما نے بتایا کہ میری خواہش قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں تھی، ایک بار میں نے ایک مسلم دوست سے مطالبہ بھی کیا تھا، کئی بار کہنے کے باوجود اس نے نہیں دیا تو میں نے سمجھا شاید غیر مذہب والوں کو نہ دیا جاتا ہو، جب میں نے بتایا کہ قرآن سب کے لئے ہے، پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے، اور سوچنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے، دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ موجود ہے، تو ڈاکٹر شرما اور دیگر لوگوں نے ہندی اور گورمکھی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

سفر کی دوسری صبح شروع ہو چکی تھی دہلی پہونچنے کی خوشی ضرور تھی لیکن شدت سے اس بات کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ پرسوں شام جس چھوٹے بھارت کو چند لوگوں نے آباد کیا تھا، وہ تھوڑی دیر بعد منتشر ہو جائے گا، ڈاکٹر شرما بھی صبح سے کئی بار اس احساس کا اعادہ کر چکے تھے، قریب بیٹھے ہوئے لوگ کہہ رہے تھے چالیس گھنٹے کیسے گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا، واقعی یہ ہماری زندگی کا یادگار سفر ہوگا، ٹرین حضرت نظام الدین ریلوے اسٹیشن پہونچنے والی تھی، میں اپنا سامان سمیٹ کر نیچے اترا، ڈاکٹر شرما اور دیگر دوستوں کو نئی دہلی ریلوے اسٹیشن تک جانا تھا، چلتی ہوئی ٹرین سے لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو ہلا کر الوداع کہا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے کچھ قریبی عزیز کسی لمبے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔

میں دیر تک سوچتا رہا کہ صدیوں سے ہندو مسلمان اور دیگر مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے ہوئے اور ان سے مختلف النوع تعلقات جیسے لین دین، شادی بیاہ اور دیگر سماجی تقریبات میں شرکت کے باوجود مسلمان اپنے وطنی بھائیوں کو اللہ کا پیغام نہیں پہنچا سکے۔ آج غلط فہمیوں کی بڑی وجہ ایک دوسرے کے بارے میں عدم واقفیت ہے، دنیاداری سے متعلق بے شمار کام تو ہم کرتے ہیں لیکن ان کے سامنے اسلام کا صحیح تعارف نہیں پیش کرتے، حتی کہ اگر کوئی وطنی بھائی قرآن کا ترجمہ یا اسلام کے کسی خاص موضوع پر کوئی کتاب کسی مسلمان سے طلب کرتا ہے تو اسے یہ کہہ کر منع کر دیا جاتا ہے کہ قرآن صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو داعی امت کا کردار ادا کرتے ہوئے ہر شخص تک اسلام کی دعوت رسول اللہ کی حدیث ”بلّغوا عنّی ولو آیۃ“ کی روشنی میں پہونچانے کی دینی ذمہ داری ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد میں نے ڈاکٹر شرما اور دیگر دوستوں کو ہندی، گورمکھی زبانوں میں ترجمہ قرآن اور دیگر کتب ارسال کیں۔ الحمد للہ کتابوں کے مطالعہ سے ڈاکٹر شرما کافی متأثر ہوئے، انہوں نے اپنے ایک طویل خط میں اپنے احساسات کا تذکرہ بھی کیا، اور یہ اعتراف بھی کیا کہ آپ کے ذریعہ بھیجی گئی کتابوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میری آنکھیں کھول دیں۔ ●●

ہمارے زمانے کا جامعہ

نسیم احمد غازی فلاحی، اسلامک ساہتیہ ٹرسٹ، نئی دہلی

(گزشتہ شماروں میں سند فضیلت حاصل کرنے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تاثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے، اس ماہ ۱۹۷۲ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک برادر بزرگ کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر)**

26 **جنوری** 1966 کی صبح مولانا جلیل احسن ندویؒ کے ہمراہ جامعۃ الفلاح پہنچا۔ اس وقت میری عمر تقریباً ۱۶ ؍سال تھی۔ میرا وطن دہلی سے متصل یوپی کا مشہور ومعروف شہر غازی آباد تھا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ! اللہ رب العزت کے خاص فضل وکرم سے مجھے نعمت ہدایت حاصل ہوئی۔ میرا تعلق اگروال خاندان سے تھا۔ یہ دولت مجھے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ افراد کے ذریعے نصیب ہوئی۔ میرے والد پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ میرے گھر میں میری والدہ، بڑے بھائی، ان کے بال بچے اور بہنیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی اسلام کے بارے میں میرے ہم خیال تھے لیکن اپنی سرکاری ملازمت اور بعض دیگر وجوہ سے دین حق کو عملاً قبول کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ گھر کے بقیہ افراد اسلام مخالف ہی تھے۔ میں اس وقت ایک کالج میں زیر تعلیم تھا اور اب میں نے اس تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اور اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر مولانا سید حامد علیؒ کے گھر میران پور کٹرہ ضلع شاہجہانپور یوپی میں رہ رہا تھا۔ مولانا مرحوم نے دینی تعلیم کے لیے مجھے جامعۃ الفلاح بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں رمضان المبارک کی تعطیل میں مولانا جلیل احسن ندویؒ بریلی آئے ہوئے تھے اور رمضان کے فوراً بعد ان کی واپسی تھی۔

چنانچہ مولانا مرحوم نے مجھے بریلی آسنسول پسنجر ٹرین میں مولانا جلیل احسن مرحوم کے حوالہ کردیا۔ مولانا مرحوم نے مجھے مولانا جلیل احسن ندوی صاحب کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ بتا دیا تھا یعنی یہ کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں اور جامعہ کے سرپرست استاد ہیں۔

ٹرین روانہ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا ندویؒ ہاتھ اور پیروں سے معذور ہیں، ان کا صرف بایاں ہاتھ ہی کام کرتا ہے۔ مولانا کی ظاہری شخصیت کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ صاحب بڑے عالم اور استاذ الاساتذہ ہیں۔ ان کا تو طلبہ اور اساتذہ مذاق بناتے اور ان کی کھلی اڑاتے ہوں گے۔ طلبہ کا ایسے شخص سے تعلیم حاصل کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے اب تک کالج کا ماحول ہی دیکھا تھا، اسی کے پیش نظر میں نے یہ رائے قائم کی۔ راستے میں مولانا ندوی نے مجھ سے کوئی خاص بات چیت نہیں کی، بس میری ضرورت کا خیال رکھا اور راستے بھر کچھ نہ کچھ کھلاتے پلاتے رہے۔ رات چار بجے شاہ گنج اسٹیشن پر اتر کر ہم چھوٹی لائن ٹرین میں اعظم گڑھ کے لیے سوار ہو گئے۔ صبح چھ ساڑے چھ بجے ٹرین اعظم گڑھ پہنچ گئی۔ مولانا نے دو رکشے کرایے پر لیے، ایک پر خود سوار ہو گئے اور دوسرے پر مجھے سوار کردیا۔ مولانا کا رکشہ آگے آگے اور میرا ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اعظم گڑھ شہر سے گزرتے ہوئے بلریا کی چنگی کے راستے بلریا گنج کی سڑک پر آ گئے۔ سڑک کیا تھی، کنکر پتھر کا ایک اوبڑ کھابڑ راستہ تھا، جس پر صرف اکا دکا رکشہ یا یکہ چلتے تھے، کوئی بس یا کار وغیرہ نہیں چلتی تھی۔ راستے میں جب بھی کوئی آبادی یا عمارت نظر آتی میں سمجھتا کہ شاید یہی وہ مدرسہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔ مگر رکشہ آگے بڑھ جاتا۔ رکشہ خراماں خراماں چلتا رہا اور تیرہ چودہ کلومیٹر کا راستہ طے کرنے کے بعد ہماری منزل آ گئی۔ اس وقت جامعہ کی نہ تو چہار دیواری تھی اور نہ کوئی گیٹ۔ جامعہ کی اصل عمارت سڑک سے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع تھی۔ اس سے پہلے کچھ کھیت تھے۔ رکشہ جامعہ کی طرف کچی سڑک پر مڑ گیا۔ جامعہ کے کھلنے میں ابھی چند دن باقی تھے، البتہ کچھ طلبہ وہاں موجود تھے جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مولانا کے رکشہ کو آتا دیکھ کر ان طلبہ نے زور زور سے ایک دوسرے کو پکارنا شروع کیا، ''مولانا آ گئے، مولانا آ گئے''، اور یہ کہتے ہوئے وہ طلبہ مولانا کی طرف دوڑ پڑے۔ پھر مولانا کے رکشہ کے اردگرد رکشہ پر ہاتھ رکھ کر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شاہی سواری جا رہی ہو اور رکشے پر دلوں کا کوئی شہنشاہ سوار ہے۔ مولانا کی رہائش گاہ مغرب کی جانب عمارت (مودودی منزل) میں تھی۔ وہاں پہنچ کر رکشہ سے سامان اتارا گیا اور مولانا کو کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ چند منٹ میں ان طلبہ نے مولانا کے کمرے کی صفائی کردی اور مولانا کے لیے چائے تیار کردی۔ مولانا سے طلبہ کا یہ والہانہ لگاؤ اور ان کے

احترام کا یہ منظر دیکھ کر میں بہت متأثر ہوا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ اس طرح کی تعلیم گاہ نہیں ہے جو اب تک میں نے دیکھی ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اللہ مجھے ایک اچھی جگہ لے آیا ہے۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ میرے حق میں بہتر ہی رہے گا۔ ابھی درس گاہ کھلنے میں کئی دن باقی تھے، اس لیے مجھے قریب ہی ایک کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔

اگلے روز صبح کے وقت ایک صاحب چھریرہ بدن شیروانی زیب تن کیے، ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے تشریف لائے۔ وہ کافی چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے سرسری سی ایک نگاہ جامعہ کے چاروں طرف ڈالی۔ یہ جامعہ کے صدر مولانا عبدالحسیب اصلاحی مدظلہ تھے۔ انہوں نے مولانا جلیل احسن ندوی صاحب سے ملاقات کی اور پھر میرے پاس آئے۔ میرے بارے میں انہیں پہلے سے مطلع کر دیا گیا تھا اور مولانا ندویؒ نے بھی انہیں بتا دیا تھا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے مجھ سے مصافحہ کیا، حال چال دریافت کیا اور بڑی محبت سے فرمایا کہ آپ کو کسی طرح کی کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ان کی بازار میں فلاں دوکان ہے۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہو وہاں جا کر لے لیا کروں۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔ اس کوٹھری نما کمرے میں جانے کے لیے بڑے سے بڑے آدمی کو سر جھکا کر جانا پڑتا تھا (اس لیے کہ اس کا دروازہ بہت چھوٹا تھا)۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے چھڑی ایک طرف رکھی، شیروانی اتاری، اور چائے بنانے کے لیے اسٹو و جلانے لگے۔ مجھے اپنے پاس فرش پر ہی بٹھا لیا۔ میں نے چائے بنانے کی پیشکش کی تو بڑے پیار سے فرمایا، نہیں بچے نہیں! انہوں نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور پھر ایک پیالی چائے میری طرف بڑھا دی، ساتھ میں گلو کوز کے بسکٹ بھی سامنے رکھ دیے۔ چائے پینے کے بعد میں نے بڑھ کر برتن دھونے چاہے مگر مولانا نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا بلکہ خود ہی برتنوں کی صفائی کی۔ میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ جامعہ کا پرنسپل اور اس کے اندر اتنی خاکساری اور طلبہ سے اس قدر محبت! میرے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔

میرے کمرے کے سامنے توت کا ایک درخت تھا۔ میں اس کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ جامعہ کے ہیڈ باورچی 'ناصر صاحب' آئے اور مجھ سے گویا ہوئے کہ مولی صاحب (مولوی صاحب) آپ کس درجے میں داخلہ لیں گے (واضح رہے کہ بستی میں جامعہ کہ ہر طالب علم اور اُستاذ کو مولی صاحب' کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔) میں نے انہیں بتایا کہ اردو نہیں آتی ہے اس لیے نیچے کسی درجے میں پڑھوں گا۔ وہ برجستہ بولے؛ تب تو آپ کے ساتھ بہت چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے۔ میں ناصر صاحب کی یہ بات سن کر پریشان ہو گیا اور میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اگلے روز ایک صاحب دراز قد، دیو قامت، لمبا کرتا، سر پر کپڑے کی ٹوپی، نصف ساق تک لنگی اور پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں (کھٹپٹی) پہنے جامعہ تشریف لائے۔ انہیں آتا دیکھ کر بہت سے طلبہ ان کے استقبال کے لیے لپکے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ مولانا شہباز اصلاحی صاحب ہیں جو جامعہ کے استاد اور مربی ہیں۔ انگلش، ہندی، اردو، عربی اور فارسی سب زبانوں کے ماہر، بہترین مقرر و مصنف ہیں۔ ان کی شخصیت گوناگوں اور ہمہ جہتی اوصاف کی مالک ہے۔ مولانا شہباز صاحبؒ کو بھی میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے حالات و کوائف معلوم کیے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ میں نے ہندی میڈیم سے مڈل پاس کیا ہے، اردو برائے نام جانتا ہوں، اس صورت میں میرا داخلہ عربی اول میں تو ہو نہیں سکتا۔ مجھے تو مکتب میں چھوٹے بچوں کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ مولانا نے میری بے چینی اور نفسیاتی کیفیت کو بھانپ لیا اور فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ تم کو مکتب میں پڑھنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ جب اردو میڈیم کے طلبہ عربی اول میں پڑھ سکتے ہیں تو پھر ہندی میڈیم کا طالب علم کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ مولانا کی اس حوصلہ افزائی سے مجھے بڑی راحت اور تقویت ملی۔

اب جامعہ کھل چکا تھا۔ داخلے شروع ہو چکے تھے۔ نئے اور پرانے طلبہ کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ میں نے ایک خاص بات یہ دیکھی کہ جب بھی کوئی بس یا سواری جامعہ کے سامنے سڑک پر رُکتی اور اس میں سے جامعہ آنے والے طلبہ اور ان کے سرپرست یا کوئی استاذ اُترتے تو طلبہ ازخود اس طرف دوڑ پڑتے اور ان کا سامان اندر تک لانے میں ان کی مدد کرتے۔ یہ سب باتیں اور دلکش ماحول مجھے اندر ہی اندر جامعہ کا گرویدہ بنا رہا تھا۔

میرے سلسلے میں ذمہ داران جامعہ نے غور کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے ایک سال اردو پڑھا دی جائے اور پھر اگلے سال عربی اول میں داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ درجہ اعدادیہ کے نام سے ایک درجہ قائم کر دیا گیا جس میں میں اکیلا طالب علم تھا۔ اور مجھ ہی سے درجہ اعدادیہ کی ابتدا ہوئی۔

ذمہ داران جامعہ نے میرے لیے درجہ اعدادیہ قائم کرنے کا فیصلہ تو کر لیا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایک طالب علم کے لیے استاد کا تقرر کس طرح کیا جائے۔ اس زمانے میں جامعہ کے مالی حالات بھی اچھے نہ تھے۔ میں نے ذمہ داران (مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا عبد الحسیب اصلاحی اور مولانا شہباز صاحب) سے عرض کیا کہ استاد کے لیے آپ فکر مند نہ ہوں۔ استاد کا نظم میں خود کر لوں گا۔ ان حضرات نے حیرت سے پوچھا کہ تم یہ نظم کس طرح کرو گے! میں نے نہایت ادب کے ساتھ انہیں یقین دلایا کہ ان شاء اللہ دو تین دنوں میں یہ نظم ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ میرے لیے نصاب تیار کر دیں

کہ مجھے کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں۔مولانا شہباز صاحب نے اگلے روز نصاب بنا کر مجھے دے دیا۔ اس میں دینیات، ہماری کتاب اور سچا دین قابل ذکر ہیں۔

میں نے دفتر تعلیمات سے شعبہ عربی کے اساتذہ کی گھنٹیوں کا چارٹ حاصل کر کے اس میں یہ دیکھا کہ کس استاذ کی کون سی گھنٹی خالی ہے اور پھر اس گھنٹی میں ان کے کمرے میں جا کر ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنی خالی گھنٹی میں فلاں کتاب پڑھا دیں۔ پہلے تو ان حضرات نے عذرات پیش کیے، لیکن میرے شدید اصرار اور شوق کو دیکھ کر وہ سبھی لوگ رضا مند ہو گئے۔اس طرح میری تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ان اساتذہ میں جو مجھے اپنی خالی گھنٹیوں میں پڑھانے پر آمادہ ہو گئے مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ اور انگلش کے استاذ ماسٹر افضال مشہدیؒ قابل ذکر ہیں۔دینیات کے لیے میں نے ثانوی کے درجے میں بیٹھنا شروع کر دیا۔یہ کلاس ماسٹر عبدالمجید صاحب کی تھی۔بعد عصر اور بعد عشاء اپنے سینئر ساتھیوں سے استفادہ شروع کر دیا۔اس طرح تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں مقیم طلبہ کے لیے دو ہوسٹل تھے۔ایک مغرب میں مودودی منزل اور دوسرا دکھن میں حسن البنا منزل۔ مجھے مودودی منزل میں بڑے طلبہ کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ کمرے کے سبھی بڑے بھائی میرا بہت خیال رکھتے۔ یہ لوگ چپکے سے کچھ رقم میرے کوٹ یا قمیص کی جیب میں رکھ دیتے اور جب میں ان لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کرتا تو یہ اندر ہی اندر مسکراتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ اللہ میاں نے رکھ دیے ہوں گے۔جامعہ کے پیارے اساتذہ، مجلس انتظامیہ کے معزز ممبران اور بڑے طلبہ ساتھیوں سے مجھے جو محبت اور پریم ملا اس نے مجھے جامعہ کا دلدادہ بنا دیا۔اُدھر بستی بلریا گنج کی معروف شخصیت حکیم محمد ایوبؒ بھی، جو جامعہ کی مجلس شوریٰ کے بنیادی رُکن اور جماعت کے امیر مقامی تھے، میرا بڑا خیال رکھتے۔انہوں نے میری چار پائی اور بستر وغیرہ کا نظم فرما دیا۔ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ محترم حکیم صاحب جامعہ کے تمام طلبہ و اساتذہ کا علاج مفت کرتے تھے، اور ان کے اصرار کے باوجود کوئی پیسہ نہیں لیتے تھے۔ یہ بڑی بات تھی۔میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک بار ایک بیرونی طالب علم کے سرپرست اپنے بچے کے علاج کے لیے حکیم صاحب کے مطب پر آئے اور ان کو دوا کے پیسے دینے پر مصر ہو گئے۔ کہنے لگے کہ حکیم صاحب اگر آپ دوا کے پیسے نہیں لیں گے تو ہم علاج نہیں کرا سکیں گے۔اس پر حکیم صاحب نے صاف طور پر کہا کہ میں جامعہ کا خادم ہوں اور جامعہ کے طلبہ سے دوا کے پیسے نہ لینے کا میں نے اصول بنایا ہے۔اس لیے میں آپ سے دوا کے پیسے نہیں لے سکتا۔آپ چاہیں تو اپنے بچے کا علاج کسی دوسرے ڈاکٹر سے کرا لیں (اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب کے اس جذبے کو

قبول فرمالیا اور انہیں اس دنیا ہی میں عزت، دولت اور نیک شہرت سے سرفراز فرمایا۔ رب کریم انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے!)۔

ابھی میری تعلیم کو شروع ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ محاورے کے مطابق سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ حکومت کے انٹلی جنس محکمے کا ایک آفیسر جامعہ آیا اور اس نے ناظم جامعہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کو میرے بارے میں بتایا کہ یہ لڑکا نابالغ ہے اور اس کا جامعہ میں پڑھنا مناسب نہیں۔ آپ اسے فوراً اس کے گھر روانہ کردیں ورنہ جامعہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ میرے گھر کے کسی فرد نے میری کوئی شکایت پولیس میں نہیں کی تھی، اس لیے از روئے قانون حکومت جامعہ کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی مجاز نہ تھی، لیکن معاملہ قانون کا نہیں، زور زبردستی اور دھاندھلی کا تھا۔ ناظم صاحب نے ذمہ دار اساتذہ سے مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ میں اس فیصلہ سے پریشان ہوگیا اور میں نے جامعہ چھوڑنے سے صاف انکار کردیا۔ جامعہ نہ چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے یہاں جو پیار اور تعاون ملا تھا اس سے میں بے حد متأثر تھا۔ میں نے پڑھا تھا کہ حضرت زیدؓ جو کہ نبیؐ کے غلام تھے جب ان کے والد اور چچا انہیں واپس لے جانے کے لیے مکہ آئے تو زیدؓ نے نبیؐ کو چھوڑ کر اپنے والد کے ساتھ جانے سے صاف منع کردیا۔ یہی کیفیت اس وقت میری تھی، کیونکہ پیروانِ رسول کریمؐ نے مجھے جو پیار اور محبت دی تھی، میں اس سے بہت متأثر تھا۔

میں نے حکیم ایوب صاحب سے مل کر انہیں صورت حال سے واقف کرایا اور اپنی خواہش اور ضرورت کا اظہار کیا۔ انہوں نے پرجوش انداز میں فرمایا: ''آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر جامعہ آپ کو رکھنے پر تیار نہیں تو آپ میرے گھر پر رہیں گے۔ اگر حکومت کو کوئی کاروائی کرنی ہے تو میرے خلاف کرے''۔ جب حکیم صاحب کی اس بات کا ذمہ داران جامعہ کو علم ہوا تو وہ پھر ایک بار غور وخوض کے لیے جمع ہوئے، اس مجلس میں محترم حکیم صاحب بھی شریک تھے۔ آخر کار مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ کچھ دنوں کے لیے مجھے گھر بھیج دیا جائے اور پھر میں اپنے گھر چلا گیا۔ راستے کے لیے حکیم صاحب نے اپنے گھر سے کھانا تیار کرا کے میرے ساتھ کیا نیز جامعہ کے انگریزی کے استاذ ماسٹر افضال مشہدی صاحب کو مجھے شاہ گنج ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے میرے ساتھ بھیجا۔ اس وقت میرا اپنے وطن آنا بہت مفید رہا۔ اس لیے کہ میرے وطن سے چلے جانے کے بعد یہاں غیر مسلموں میں بڑی بے چینی تھی اور ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مجھے دیکھ کر میرے ان ''کرم فرماؤں'' نے راحت کی سانس لی۔ حالات کچھ نارمل ہوئے تو میں دوبارہ جامعہ آگیا۔ اس بار میرے بڑے بھائی نے جو میرے سرپرست بھی تھے جامعہ کے نام ایک تحریر

میرے داخلے کے سلسلے میں لکھ کر دے دی تا کہ جامعہ کی قانونی پوزیشن مضبوط رہے۔ میری تعلیم حسب سابق شروع ہوگئی۔ ایک سال کے بعد میرا داخلہ عربی اول میں ہوگیا۔

اس زمانے میں بہار وغیرہ میں زبردست قحط پڑا تھا جس کی وجہ سے جامعہ کی مالی حالت بھی بڑی خستہ تھی۔ کھانے کی چیزوں کی بھی قلت تھی۔ کھانا بہت معمولی اور ناپا تلا ملتا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اِس وقت جامعہ کے کھانے کا معیار اُس وقت کے مقابلے میں بہت اچھا ہے، لیکن ہم طلبہ نے کھانے کے گھٹیا معیار کو کبھی اپنی تعلیم وتربیت میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ چھٹیوں میں اپنے وطن جاتا تو دیکھتا کہ میری (غیر مسلم) والدہ میرے لیے بہت فکر مند ہیں۔ وہ میرے کھانے کے بارے میں دریافت کرتیں! میں سوچتا کہ اگر ان کو صحیح صورت حال بتا دی گئی تو وہ اور زیادہ پریشان ہوجائیں گی اور ممکن ہے مجھے جامعہ نہ جانے دیں۔ اس لیے میں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اور اس خیال سے کہ میرا تعلیمی سلسلہ متأثر نہ ہوجائے، میں والدہ سے کہتا کہ جامعہ میں کھانا نہایت عمدہ ملتا ہے۔ صبح ناشتے میں اصلی گھی کا حلوہ، دودھ اور انڈا ملتا ہے۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں سبزی، بکرے کا گوشت، روٹی اور دال چاول ہوتا ہے۔ عصر کے بعد پھل اور سوتے وقت ایک گلاس گرم دودھ پینے کو ملتا ہے (ہمارے گھر پر رات میں دودھ پینے کا معمول تھا)۔ یہ سن کر والدہ کو قدرے اطمینان ہوتا۔

بعض سینئر اساتذہ کا خیال تھا کہ طلبہ کو پوری یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرنے میں لگنا چاہیے اور جماعت کے پروگراموں میں عملی حصہ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے مگر بعض دیگر اساتذہ کا خیال تھا کہ طلبہ کو جماعت کے پروگراموں میں شرکت کرنی چاہیے تاکہ ان کی عملی تربیت بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہے۔ خاص طور پر مولانا شہباز صاحبؒ ہمیں جماعت کے پروگراموں میں شرکت پر ابھارتے۔ جمعہ کے دن طلبہ کے مختلف گروپ بنا کر آس پاس کے دیہاتوں میں بھیجا جاتا، تاکہ وہاں جمعہ میں تقریر اور لوگوں سے ملاقات کرسکیں۔ ضلعی اجتماعات میں بھی طلبہ شرکت کرتے۔ اس میں جامعہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بلریا گنج بستی میں جماعت کی طرف سے ہر ہفتے صفائی کی مہم چلائی جاتی تھی۔ جامعہ کے طلبہ بھی اس مہم میں شریک ہوتے اور بستی کی گلیوں اور نالیوں کی صفائی کرتے۔ بستی کی ہر دل عزیز اور محترم شخصیت حکیم ایوب صاحب امیر مقامی تھے۔ وہ بھی دیگر رفقاء کے ساتھ اس مہم میں شریک ہوتے۔ غیر مسلم محلے میں جب حکیم صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ صفائی کے لیے پہنچتے تو وہاں کی عورتیں اور مرد ہاتھ جوڑ کر حکیم صاحب کی خوشامد کرتے کہ وہ ہماری گلی اور نالی کی صفائی کرکے ہمیں گنہگار اور غضب الٰہی کا حقدار نہ بنائیں۔ چنانچہ وہ زبردستی حکیم صاحب اور دیگر لوگوں سے جھاڑو وغیرہ لے کر خود صفائی کرتے۔ یہ منظر بڑا ہی

عجیب ہوتا تھا، جودعوتی کام کے لیے راہ ہموار کرتا تھا۔

مولانا شہباز صاحبؒ اور ماسٹر افضال مشہدی صاحبؒ خاص طور پر ہم لوگوں کو مضامین، افسانے اور کہانیاں لکھنے پر ابھارتے۔ مثلاً ''قیامت کے دن سات لوگوں کو عرش الٰہی کے سایے میں جگہ ملے گی''، اس حدیث کے پیش نظر مولانا شہباز صاحب نے فرمایا کہ کوئی طالب علم اس کی روشنی میں ایک افسانہ لکھ دے۔ میں نے پیشکش کی اور ''ریزرویشن'' کے نام سے ایک افسانہ تحریر کیا، جسے مولانا نے دیکھا اور پھر ''نور، رامپور'' میں شائع ہوا۔ اسی طرح متعدد مضامین لکھنے کا طلبہ کو موقع ملتا۔

کبھی کبھی افسانہ نویسی اور مضمون نویسی کے مقابلے بھی کرائے جاتے۔ ایسے ہی ایک مقابلے میں مجھے بھی حصہ لینے کا موقع ملا۔ اور میرے افسانہ کو اول انعام ملا۔ یہ پروگرام جمعیۃ الطلبہ کے معمول کے پروگراموں کے علاوہ ہوتے تھے۔

اساتذہ طلبہ کے ذاتی اور گھریلو مسائل میں بھی ایک سرپرست کی طرح رہنمائی فرماتے۔ ایک بار میری والدہ نے (اس وقت تک وہ مشرف باسلام نہیں ہوئی تھیں) مجھے ایک نہایت جذباتی اور درد سے لبریز خط لکھا۔ میں اس خط کو پڑھ کر پریشان ہوگیا، اور والدہ کے اندیشوں کو غلط ثابت کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے مولانا شہباز صاحب کو وہ خط دکھایا۔ اور اس کے جواب میں میرے ذہن میں جو باتیں تھیں ان کو بیان کیا۔ مولانا نے فوراً جواب تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے والدہ کے نام جواب تیار کیا۔ مولانا چونکہ ہندی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اسے پڑھا اور جواب سے بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ میں نے وہ تحریر اپنی والدہ صاحبہ کو بھجوادی۔ مولانا شہباز صاحبؒ اور ماسٹر افضال مشہدی صاحبؒ کے مشورے پر اس تحریر کو اردو زبان میں منتقل کر کے ماہنامہ 'الحسنات' رامپور میں شائع کرادیا گیا۔ بعد میں یہ تحریر ''نومسلم بیٹے کا ماں کے نام خط'' کے عنوان سے ملک اور بیرون ملک کی مختلف زبانوں میں شائع ہوئی اور اب ''پیاری ماں کے نام اسلام کا پیغام'' کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔ اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہمارے اساتذہ صرف درس وتدریس تک ہی محدود نہ تھے بلکہ طلبہ کے ذاتی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ صرف ناصح نہ تھے بلکہ غم گسار اور چارہ ساز بھی تھے۔

اساتذہ جامعہ کی کوشش ہوتی کہ جامعہ کے کام خود طلبہ انجام دیں۔ چنانچہ مسجد، میدان اور کمروں کی صفائی، نیز بیت الخلاء کی صفائی وغیرہ امور طلبہ ہی انجام دیتے، نیز وہ باغبانی بھی کرتے۔ خاص بات یہ تھی کہ اساتذہ بھی ان کاموں میں برابر کے شریک ہوتے۔ جامعہ کی عظیم الشان مسجد خصوصاً مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب مدظلہ العالی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، مولانا طلبہ کو مسجد کے کام کے لیے

ابھارتے اور طلبہ بخوشی اس 'کارسیوا' میں شریک ہوتے۔ مسجد میں اینٹیں اور دیگر مٹیریل اکثر و بیشتر طلبہ ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا، اس وجہ سے طلبہ کو جامعہ سے محبت ہونا ایک فطری امر تھا۔

مسجد کی تعمیر کے لیے بڑے سرمایے کی ضرورت تھی۔ مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب ہم طلبہ کو مقامی آبادی اور قرب و جوار کے گاؤں میں چندہ جمع کرنے کے لیے بھیجتے۔ وہاں کے لوگوں کا جذبہ انفاق بھی کیا خوب تھا! مرد اور خواتین سب دل کھول کر چندہ دیتے۔ کوئی نقد رقم دیتا اور کوئی اپنے زیور۔ یہاں تک کہ لوگوں نے بکریاں، مرغیاں، برتن، نئے کپڑے، بعض نے اپنی سائیکل تک چندے میں دی۔ بعد میں ان چیزوں کو فروخت کیا گیا اور ان کی رقم کو داخل حساب کر دیا گیا۔

اساتذہ و طلبہ کی کوشش ہوتی کہ جامعہ کے اوپر اخراجات کا کم سے کم بار ڈالا جائے۔ بہت سے ایسے کام جن میں کافی رقم خرچ ہوتی ہے خود کر لیے جائیں۔ جامعہ کے مشرق جنوب میں بیت الخلاء اور غسل خانے تعمیر کیے گئے تھے۔ اور قریب ہی ایک کافی بڑا سیفٹی ٹینک بنایا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ٹینک بھر گیا اور بند ہو گیا۔ صفائی کرنے والوں کو بلایا گیا۔ انہوں نے اس کی صفائی کے لیے بڑی رقم طلب کی۔ مولانا شہباز اصلاحی صاحب اور مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب نے بڑے طلبہ کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، نیز یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم سب مل کر اس ٹینک کی صفائی کر دیں اور جامعہ کو زیر بار ہونے سے بچالیں۔ طلبہ اس کے لیے بخوشی تیار ہو گئے اور اسی وقت سب لوگ صفائی کے لیے نکل پڑے۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ مولانا شبیر اصلاحی ٹینک میں اترے ہوئے ہیں اور بالٹی بھر بھر کر دے رہے ہیں ۔ مولانا شہباز صاحب بھی اس کام میں شریک ہیں، چند گھنٹوں میں ٹینک کی صفائی ہو گئی اور اس طرح جامعہ کی کافی رقم بچ گئی۔

ہمارے زمانے میں طلبہ و اساتذہ کا تعلق ادب و احترام کے ساتھ ساتھ دوستانہ بھی تھا۔ طلبہ بے تکلف اپنی پریشانی اپنے اساتذہ کے سامنے رکھتے اور ان کے مشورے اور ہدایت طلب کرتے۔

طلبہ اساتذہ کا بڑا احترام کرتے اور ان کی خدمت کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ اگر کوئی استاذ اپنا لوٹا لے کر پانی لانے کے لیے نکلتے تو کئی طلبہ ایک ساتھ لپک کر ان کے ہاتھ سے لوٹا لے لیتے اور پانی بھر کر کمرے میں پہنچا دیتے۔ طلبہ کے جذبہ خدمت اور احساس ذمہ داری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی کوئی مہمان یا جامعہ کا کوئی شخص جامعہ پہنچتا تو طلبہ خود سے دوڑ کر جاتے اور اس کا سامان اٹھاتے۔

طالب علم صرف کتابوں ہی سے نہیں سیکھتا بلکہ اپنے معلم اور ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔

تجربے کی بات یہ ہے کہ کسی کتاب کا اثر اتنا زیادہ نہیں پڑتا جتنا اس کو پڑھانے والے استاد کے اخلاق کا اثر انسان کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ اس پہلو سے میں کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی ہمارے اساتذہ ہمارے لیے نمونہ تھے اور ان کی اعلیٰ ظرفی، بلند اخلاقی اور ان کے ایثار اور قربانی کے جذبے کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے صرف دو نمونے ملاحظہ کریں:

مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب ہمارے استاذ تھے۔ کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گئے۔ کچھ ہی دونوں کے بعد ششماہی امتحان آ گیا۔ جامعہ کا قاعدہ تھا کہ جو استاد جو مضمون پڑھاتا اس کا پرچہ وہی بناتا اور وہی امتحان کی کاپی چیک کرتا۔ صرف ونحو مولانا موصوف پڑھاتے تھے۔ چنانچہ اس کا پرچہ بھی انہوں نے ہی بنایا تھا اور ان کو ہی اس مضمون کی کاپیاں چیک کرنی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ چونکہ مولانا مجھ سے سخت ناراض ہیں اس لیے اس مضمون میں یا تو مجھے فیل کر دیا جائے گا یا پھر بہت معمولی نمبروں سے پاس کیا جائے گا۔ مگر ہمارے استاذ کی اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ وہ میرے جوابات سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے اس نالائق شاگرد کو جس سے انہیں کچھ شکایات تھیں 50 میں سے 51 نمبر عنایت فرمائے (اس بات کا چرچا جامعہ میں بہت دنوں تک رہا۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے مجھے بلایا اور اپنے مخصوص انداز میں پوچھا، کیا جی! تم نے مصنف سے بھی اچھا لکھ دیا تھا! میں نے عرض کیا، مولانا! مصنف بھی انسان تھے اور میں بھی انسان ہوں، آدمی مصنف سے اچھا لکھ سکتا ہے۔ بہر حال مولانا بہت خوش ہوئے)۔ ایسے بلند اخلاق اور اعلیٰ ظرف اساتذہ سے انسان متأثر کیوں نہ ہوگا، اور ان کی صفات اپنے اندر پیدا کیوں نہیں کرے گا۔

ایک بار مولانا جلیل احسن ندویؒ نے کسی معمولی بات پر مجھے ڈانٹ دیا۔ اس کی وجہ سے میں بھی دو روز ان سے ملاقات کے لیے نہیں گیا۔ تیسرے دن کسی کے ذریعے مولانا نے مجھے بلایا۔ میں پہنچا تو دیکھتے ہی فرمایا: کیا جی! ذرا سا ڈانٹ دیا تو ناراض ہو گئے۔ چلو ادھر آؤ اور الماری میں سے مٹھائی کا وہ ڈبہ اٹھا کر لاؤ۔ میں نے ڈبہ مولانا کو لا کر دیا، انہوں نے اسے کھولا اور مجھ سے فرمایا کہ یہ اور یہ میرے لیے چھوڑ دو اور بقیہ وہاں بیٹھ کر کھاؤ۔

یہ تھے انداز نرالے ہمارے بزرگ اساتذہ کے!

طلبہ ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے خصوصاً بڑے طلبہ اپنے چھوٹے بھائیوں کا۔ کوئی بیمار ہوتا یا اسے کوئی دوسرے ضرورت ہوتی تو اسے اکیلے اور بے سہارا ہونے کا کبھی احساس نہ ہونے دیا جاتا۔ بے سہارا اور ضرورت مند ساتھیوں کے تعاون کے لیے بڑے طلبہ نے فیصلہ کیا کہ ضرورت کی چیزوں

مثلاً شکر، صابون، تیل، اسٹیشنری وغیرہ کے لیے ایک اسٹور قائم کیا جائے تا کہ اس کی آمدنی سے مستحق طلبہ کا تعاون ہو سکے۔ چنانچہ وہ اسٹور بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا جاتا رہا۔

اپنے اساتذہ سے طلبہ کے والہانہ قلبی لگاؤ کا ایک نمونہ دیکھیے کہ ایک بار مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب مدظلہ العالی کو ان کے گھر علاؤالدین پٹی میں سانپ نے کاٹ لیا۔ مولانا کو چارپائی پر لٹا کر جامعہ لایا گیا۔ اعظم گڑھ ہسپتال لے جانے کے لیے ٹیکسی کا انتظام کیا گیا۔ مولانا چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ یا بے چینی نہیں تھی۔ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ سب سے مصافحہ کر رہے تھے۔ اپنی غلطیوں کے لیے معافی طلب کر رہے تھے اور اللہ سے مغفرت کی دعا کے لیے درخواست کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹیکسی آ گئی اور مولانا کو اعظم گڑھ لے جایا گیا۔ ادھر طلبہ جامعہ کی مسجد میں جمع ہو گئے اور اپنے مشفق و محسن استاد کی صحت کے لیے رو رو کر اور گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگے۔ خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ہر طالب علم اللہ سے گڑ گڑا کر یہ دعا کر رہا تھا کہ پروردگار! تجھے ہماری جو نیکی بھی پسند آئی ہو اس کے وسیلے میں ہمارے استاد کو شفا عطا فرما دے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اللہ رب العزت نے ہماری دعائیں سن لیں اور مولانا شفایاب ہو کر آ گئے۔ اللہ ان کا سایہ ہم پر تا دیر قائم رکھے!

جامعہ کے ہم اور ہمارے خاندان پر اس قدر احسانات ہیں کہ جنہیں نہ تو بھلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کا کما حقہ بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ میرے بڑے بھائی نے اپنے دو بچوں اوما کانت اور انل کمار کو ماحول کی خرابی کے سبب میرے ساتھ جامعہ بھیج دیا۔ جامعہ کے ذمہ داران، اساتذہ اور طلبہ نے ان کا تہ دل سے استقبال کیا اور ان بچوں کے ساتھ ایسا رویہ اپنایا کہ چند ماہ کے اندر ہی اوما کانت شمیم غازی اور انل کمار وسیم غازی ہو گئے اور ان کے اندر نہایت خوش گوار تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ اس کے بعد میرے مزید تین بھتیجے تعلیم کے لیے جامعہ پہنچے۔

طلبہ کے ساتھ جامعہ کے اساتذہ کا تعلق کتنا جذباتی تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

بستی کے ایک صاحب نے ان کے پیڑ سے مسواک توڑنے پر ایک طالب علم کو گالی دے دی۔ مولانا جلیل احسن ندوی صاحب کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہوں نے ناظم جامعہ جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجا کہ مجھے گاؤں کے ایک شخص نے گالی دی ہے۔ جب وہ رقعہ ناظم جامعہ کو ملا تو وہ اسے پڑھ کر گھبرا گئے اور ہانپتے، کانپتے فوراً اپنی سائیکل سے جامعہ آئے اور مولانا سے

ملاقات کی۔ بڑی گھبراہٹ اور تشویش کی کیفیت کے ساتھ مولانا سے دریافت کیا کہ کس بد بخت نے آپ کے ساتھ گستاخی کی ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ فلاں شخص نے ایک طالب علم کو گالی دی ہے تو گویا اس نے مجھے ہی گالی دی ہے۔

ناظم صاحب نے بلا تاخیر گاؤں میں پنچایت طلب کی اور ان صاحب کو بھی اس میں بلایا گیا۔ ان کی سرزنش کی گئی اور آئندہ بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور درختوں سے مسواک وغیرہ توڑنے سے روکنے سے صاف طور پر منع کر دیا گیا۔

ہمارے زمانے میں طلبہ کی تعداد بہت کم تھی اور اس میں ہر سال اضافہ ہو رہا تھا۔ جو بھی شخص جامعہ بغرض تعلیم آتا تھا اس کا مقصد علم دین کا حصول ہی ہوا کرتا تھا۔ جامعہ نے اپنے مقاصد میں جن امور کا تذکرہ کیا تھا ان میں مسلمانوں کے لیے خصوصاً تحریک اسلامی سے وابستہ لوگوں کے لیے بڑی کشش تھی۔

درجے میں اس بات کا اہتمام کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ اساتذہ اور طلبہ مطالعہ کر کے آئیں۔ اگر کوئی استاذ کسی وجہ سے مطالعہ کر کے نہیں آتے تو وہ اس دن طلبہ کو پڑھانے کے بجائے کوئی دوسری گفتگو کرتے۔ ہمیں عربی سوم میں قرآن مجید مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب سے پڑھنے کا موقع ملا۔ موصوف دوستانہ انداز اور خوشگوار ماحول میں بے تکلفی کے ساتھ کلاس لیتے اور خود طلبہ کے ذریعے ہی مقامات حل کراتے۔ قرآن مجید کوئی درسی کتاب نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی ایک سورہ بھی مطلوبہ اصولوں کے ساتھ پڑھ لی جائے تو گویا آدمی پورا قرآن خود سے پڑھ سکتا ہے۔ اس کا نمونہ سبحانی صاحب کے یہاں ملتا تھا۔ ان سے قرآن پڑھنے کے بعد آج بھی وہ انداز اور طریقہ ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے اور آج بھی وہ دوران مطالعہ قرآن معاون و مددگار ہے۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ سے آخری درجوں میں قرآن پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ ان کا انداز تدریس جداگانہ تھا۔ وہ دوران تدریس تقابل کے لیے مختلف تراجم وتفاسیر بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ کسی آیت کے سلسلے میں دوران تدریس مولانا مودودیؒ یا مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو خط لکھواتے اور اس آیت کے سلسلے میں ان کی رائے دریافت کرتے۔ اگر کوئی جنسی یا اس قبیل کا کوئی موضوع زیر بحث آجاتا تو مولانا عربی زبان میں گفتگو کرتے۔ اس میں پردہ داری کی شان پیدا ہو جاتی۔ مولانا ندویؒ بھی کلاس کے ماحول کو طلبہ کے لحاظ سے بڑا خوش گوار رکھتے۔ ایک بار ہمارے کلاس کے ایک ساتھی نے مولانا ندویؒ سے دریافت کیا کہ مولانا، سجدے میں کیا 'سبحان ربی الاعلیٰ' کے علاوہ بھی کوئی دعا پڑھ سکتے ہیں۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا، ہاں کیوں نہیں! آپ یہ دعا بھی پڑھ سکتے ہیں کہ اللھم زوجنی (اے اللہ! میری شادی کرادے) اس پر کلاس کا جو ماحول بنا اس کا اندازہ

آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اساتذہ کا احترام بھی ہے۔ ان کی خدمت بھی ہے اور ان سے قربت بھی ہے۔

اس زمانے میں نہایت جلیل القدر اور لائق اساتذہ جامعہ کو میسر تھے۔ جن میں مولانا جلیل احسن ندوی صاحبؒ، مولانا شہباز اصلاحی صاحبؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب، مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحبؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحبؒ اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی قابل ذکر ہیں۔ انگریزی کی تعلیم کے لیے ماسٹر افضال مشہدی صاحب اور معاشیات وسیاسیات کے لیے ماسٹر مناظر احسن صاحب کی خدمات حاصل تھیں۔ بعد میں مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب بھی آ گئے، جو استاذ کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی تھے۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ کبھی بھی جونیئر اساتذہ سینئر اساتذہ سے استفادہ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سے جونیئر طلبہ اپنے سینئرس سے استفادہ کرتے۔

جامعہ کے تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی طرف پوری توجہ تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں جتنی زیادہ فکرمندی جامعہ میں پائی گئی شاید کہیں دوسری جگہ دیکھنے کو نہ ملے۔

اساتذہ کے اندر احساس ذمہ داری نمایاں نظر آتا اور وہ ٹیم ورک کے ساتھ خدمت انجام دیتے۔ یوں بعض لوگوں کو ذمہ داروں سے اختلاف بھی ہوتا مگر جب ان سے جامعہ کے کسی کام کے لیے کہا جاتا تو نہایت دلجمعی اور ذوق وشوق کے ساتھ خدمت انجام دیتے۔ ثانوی کے ایک استاذ ماسٹر جنید احمد صاحب کو صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب سے اکثر شکایات رہتیں، یہ بات سب جانتے تھے۔ ایک روز ماسٹر جنید صاحب نے ہم لوگوں سے کہا کہ مولانا جب بھی مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے ہیں انکار نہیں ہوتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کا احترام اور جامعہ کی خدمت کا جذبہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا۔

ذمہ داران تعلیم وتربیت کی خواہش بلکہ ان کا عمل اس پر تھا کہ خصوصاً سینئر طلبہ سے جامعہ کے نظم وانصرام اور تعلیم وتربیت میں تعاون لیا جائے۔ چنانچہ اس کے مثبت اثرات واضح طور پر سامنے آتے۔ طلبہ واساتذہ ایک فیملی کے افراد نظر آتے۔ اور طلبہ جامعہ کی خدمت کے لیے ہر آن تیار رہتے۔ جامعہ کے طلبہ کے لیے ریلوے ٹکٹ میں رعایت کا مسئلہ سامنے آیا تو ہماری کلاس کے ایک ساتھی عبدالہادی صاحب نے مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے ساتھ پورا تعاون کیا اور ان کے ہمراہ بنارس جا کر اپنے ایک عزیز جو ریلوے میں ملازم تھے ان کے تعاون سے طلبہ کے لیے رعایت حاصل کر لی جو ہنوز جاری ہے، الحمدللہ!

طلبہ دسترخوان پر اجتماعی طور پر ناشتہ اور کھانا کھاتے۔ کھلانے والے بھی طلبہ ہی تھے۔ ان کی باریاں مقرر ہوتیں۔ اس کے یقیناً کئی فائدے تھے، مگر ہماری خواہش ہوتی کہ کاش کھانا کمرے ہی میں آجایا کرے۔ خاص طور سے ناشتہ۔ اس لیے کہ کھانے کے انتظار اور آنے جانے میں خاصا وقت صرف ہوجاتا تھا۔ مغرب تا عشاء کا وقت عام طور پر کھانے کی نذر ہوجاتا۔ اسی طرح صبح ناشتے میں قیمتی وقت صرف ہوجاتا اور اس سے مطالعے کی یکسوئی متأثر ہوتی۔ اب تو کھانا کمرے میں آنے لگا ہے۔

جب کسی نئے طالب علم کا داخلہ ہوتا تو سینئر طلبہ اس سے آگے بڑھ کر دوستی اور اپنائیت کا ہاتھ بڑھاتے۔ اس کا ہر ممکنہ تعاون کرتے۔ اس سے بہت سے فائدے سامنے آتے۔ کئی طلبہ طرح طرح کے مسائل بھی پیدا کرتے اور جامعہ کے ماحول کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اچھی بات یہ تھی کہ ایسے افراد کو راستے پر لانے یا جامعہ کو ان سے نجات دلانے کے لیے خود طلبہ ہی اہم رول ادا کرتے۔

ہمارے زمانے میں جامعہ کی مجلس شوریٰ کا نام مجلس انتظامیہ تھا۔ اس میں اساتذہ کے علاوہ بستی کے لوگ اور بعض دوسرے مقامات کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان ممبران میں بہت سے مسائل میں کافی اختلافات بھی موجود تھے۔ لیکن ایک خاص بات جو ہم نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان ممبران میں جامعہ کی خدمت کا جذبہ جنون کی حد تک پایا جاتا تھا۔

مقامی بستی اور قرب وجوار کی آبادیوں کے لوگ جامعہ کو اپنے لیے باعث سعادت اور باعث خیر وبرکت سمجھتے تھے اور جامعہ کی ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ جامعہ کی بقا اور ترقی میں ان لوگوں کے تعاون سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تعلیم وتربیت پر غور وخوض کے نتیجے میں ہمارے بیچ کا فضیلت میں ایک سال کا مزید اضافہ کردیا گیا۔ اس پر ہم لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور ہمیں ایک سال مزید رہنے کا موقع ملا۔

جب جامعہ کے حالات وکوائف پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو پرت در پرت باتیں سامنے آتی جاتی ہیں۔ جن کا تذکرہ یقیناً ضروری ہے اور مفید معلوم ہوتا ہے مگر مزید تفصیلات کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

آخر میں اس بات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے جامعہ میں سب کچھ اچھا ہی اچھا ہو، یہ بات بالکل نہیں تھی۔ اس زمانے میں بھی مختلف پہلوؤں سے بہت سی خامیاں اور کمزوریاں موجود تھیں، مگر ان کو دور کرنے کی فکر اور کوشش وابستگان جامعہ کے اندر کبھی سرد نہیں پڑی۔ اور ہاں! طلبہ نے ان کی وجہ سے نہ تو اپنی تعلیم وتربیت کو متأثر نہیں ہونے دیا اور نہ جامعہ سے تعلق خاطر کو کمزور پڑنے دیا۔

آزادئ رائے کی اہمیت

اوراس کے لیے ماحول سازی میں علماء کا کردار

- آزادی رائے کیا ہے، علم وتحقیق کے اس دور میں اس کی کیا اہمیت ہے، اور قرآن وسنت سے ہمیں اس سلسلے میں کیا رہنمائی ملتی ہے؟
- امت بالخصوص ملت اسلامیہ ہند کے تناظر میں آزادی رائے کی کیا صورتحال ہے؟ عام افراد امت سطح پر بھی اور پھر علماء کرام کی سطح پر بھی؟
- امت کے فکری بحران کے ازالے یا موجودہ فکری جمود کو توڑنے میں آزادی رائے کا کیا کردار ہوسکتا ہے؟ اسی طرح امت کی فکری وحدت میں اس کا کیا کردار ہوسکتا ہے؟
- کیا آزادی رائے کی اس اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اس کے لیے ماحول سازی ضروری نہیں؟ اگر ہاں، تو اس کے سلسلے میں علماء کرام کیا کچھ کردار ادا کرسکتے ہیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو ”آزادی رائے کی اہمیت اور اس کے لیے ماحول سازی میں علماء کا کردار“ سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

شبیر احمد فلاحی، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا۔نئی دہلی۔موبائیل نمبر:
08750368163

انسان جس طرح کسی مسئلہ میں اپنی ذاتی رائے قائم کرتا ہے اور یہ اس کا حق ہے، اسی طرح اپنی رائے کے اظہار کا بھی اس کو پورا حق ہے۔رائے انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔اجتماعی رائے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی جماعت، تنظیم، سوسائٹی یا ریاست سے وابستہ ہو اور اس کی نمائندگی کرتے ہوئے کسی رائے کا اظہار کرے۔اس صورت میں اس پر پابندیاں اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں نیز بعض تحفظات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔جہاں تک انفرادی رائے کا تعلق ہے تو ہر فرد کو اخلاقی حدود اور تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے اخلاص اور دیانتداری کے ساتھ اظہار رائے کی نہ صرف آزادی ہوتی ہے بلکہ بعض مخصوص حالات میں یہ فرض ہو جاتا ہے۔کیونکہ ایسا کرنا اجتماعیت کے ساتھ ہمدردی اور وفاداری کا ہم معنی ہے۔

اس ضمن میں یہ حقیقت ذہن میں واضح رہنی چاہئے کہ رائے کی حیثیت کبھی مشورہ کی بھی ہوتی ہے۔اس صورت میں وہ افراد جو غور وفکر کے عادی نہیں ہوتے یا ہوتے تو ہیں لیکن کسی وجہ سے کسی موضوع کے بعض خاص پہلو نظر سے مخفی رہتے ہیں ان کو آگاہ کرنا اور تفکر کی دعوت دینا مقصود ہوتا ہے۔اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حریت رائے کے اظہار کے دوران سب سے اہم اور نازک مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے جب بہت سی قیمتی رائیں باہم متصادم ہونے لگتی ہیں، اور ہر رائے دہندہ اپنے خاص زاویہ نگاہ سے اپنی رائے کو فائق اور قابل ترجیح تصور کرتا ہے۔اس صورتحال میں دونوں امکانات کا ہونا باعث حیرت نہیں ہونا چاہئے۔بعض رائیں انتہائی اخلاص اور دیانتداری پر مبنی ہوتی ہیں، چاہے حصول مقصد کے لیے زیادہ مفید نہ ہوں لیکن نقصاندہ بھی نہ ہوں۔بعض رائیں اساسی نہیں ہوتیں بلکہ دوسروں کی آراء یا ان کی شخصیات پر مبنی ہوتی ہیں یا سرے سے ذاتی فکر ونظر کی پیداوار نہیں ہوتی ہیں بلکہ دوسروں سے مستعار لی گئی ہوتی ہیں۔

انسانی فطرت ہے کہ تحت الشعور میں بعض خیالات وتصورات دبے ہوتے ہیں جس کا انسان کو اندازہ اور احساس نہیں ہوتا۔جب انہیں کوئی دوسرا پیش کرتا ہے تو اچانک اندر کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے۔وہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی دل کی بات ہے۔مثلاً کوئی پیاسا ہو، فریج میں پانی موجود ہے مگر اس کو یاد نہیں، کسی دوسرے کو پانی طلب کرتے ہوئے سنا تو فوراً اپنا پانی یاد آگیا۔اس طرح کے واقعات

انسانوں کے ساتھ اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔

اظہار رائے کی آزادی گرچہ انسان کا حق ہے پھر بھی اس پر قدغن لگائی جاتی ہے۔ کیونکہ بسا اوقات کسی فرد یا حکومت کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے، اور کبھی کسی جماعت یا تنظیم میں خلل کا باعث بنتی ہے۔ بہر حال اس کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس سماج کے افراد اپنی ذاتی رائے نہ رکھتے ہوں، مسائل پر غور و فکر کے عادی نہ ہوں، آنکھیں بند کر کے ہر ایک کے پیچھے چل پڑتے ہوں، وہ سماج جمود و رکود کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اصحاب رائے ناپید ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً کسی مسئلے کا حل تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جس طرح رائے قائم کرنا، اس کا اظہار کرنا، اور کسی کو رائے دینا آسان نہیں ہے، بلکہ بہت ذمہ داری اور دیانت داری کا متقاضی ہے، اسی طرح رائے طلب کرنا اس سے زیادہ نازک اور اہم ہے۔ رائے صرف اسی شخص سے لینی اور اسی شخص کی قبول کرنی چاہیئے جو سنجیدہ اور مخلص و دیانتدار ہونے کے ساتھ ساتھ کارزارِ حیات کے مختلف نشیب و فراز سے گزرتا رہتا ہو، زندگی کے مختلف میدانوں میں رہتے ہوئے حالات کا باریکی اور گہرائی سے مشاہدہ کرتا ہے، اور تجربات کی دھوپ میں تپ کر نکھر گیا ہو۔ علم تو بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے، لیکن مذکورہ صفات سے اکثر لوگ محروم رہتے ہیں۔ جو اذہان متحرک اور فکرمند ہوں گے فطری طور پر کسی نہ کسی درجے کے اصحاب الرائے ہوں گے۔ ظاہر ہے اس اہم کام کے لیے عاقل و حازم کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔

یہ کام بھی بہت اہم ہے۔ اس کے لیے ماحول پیدا کرنا اشد ضروری ہے۔ کسی اجتماعیت کا ہر فرد اگر یہی سوچ کر بیٹھا رہے کہ فلاں صاحب سوچ کر ہمیں کچھ بتائیں گے پھر ہم ان کی سن کر غور کریں گے اور ہو سکا تو عمل بھی کر لیں گے تو یہ انداز فکر اجتماعیت کی صالح نشو و نما کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ آج ہماری ملت، امت اور جماعت اسی خطرناک بیماری کا شکار ہیں۔ اس مرض کا علاج صرف علماء کا طبقہ کر سکتا ہے، لیکن افسوس کہ اس کو اس کا اندازہ نہیں ہو پا رہا ہے، بہت سے معالج مریض کا صرف چہرہ دیکھ کر اور نبض پر انگلی رکھ کر مرض کا پتہ ہی نہیں اس کی نزاکت کا بھی سراغ پا جاتے ہیں۔ آج ہمارے قائدین مریض امت کی کراہ سن کر بھی سمجھتے ہیں کہ اس کی صحت ٹھیک ہے۔ آج ایسے قائدین کی ضرورت ہے جو گہری دینی بصیرت رکھتے ہوں، کتاب و سنت کا براہ راست علم رکھتے ہوں، اسلامی علوم کے مآخذ تک رسائی کی صلاحیت رکھتے ہوں، کیونکہ صحیح رائے وہی دے سکتے ہیں اور انہیں حضرات سے رائے لینی چاہیئے۔ اس سے ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کا خوابیدہ فکر بیدار ہوگا۔

رضوان احمد فلاحی، لندن۔ ای میل: rizwanfalahi@hotmail.com

فکرورائے کی آزادی ایک اہم ترین نعمت الٰہی ہے۔اس نعمت کی قدر و قیمت سے جونفوس واقف ہوتے ہیں وہ جائز حدود میں رہتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں اوراس کی بدولت فکری وعلمی سرمایے میں مثبت اضافے کا موجب بنتے ہیں۔سوچنے والے اذہان کی کوشش ہوتی ہے کہ زیرغور معاملے کے سارے پہلوحتی الامکان نگاہ کے سامنے رہیں اور وہ اس کے مالہ وما علیہ سے پوری طرح آگاہ ہوں تاکہ بہتر سے بہتر نتائج تک پہنچا جاسکے۔

فکرانسانی کی تاریخ میں اسلام وہ تنہا دین ہے جس نے بنی نوع انسان کوتدبر، تفکر اور تعقل کی دعوت دی ہے،(أفلا يتدبرون، لعلهم يتفكرون، لقومٍ يعقلون)۔اس پہلو سے عہدنبوی کے بعد سے گزشتہ تقریباً ایک ہزارسال کے دوران وجود پذیر ہونے والے فکری وعلمی سرمایے پرسرسری نظر بھی یہ حقیقت عیاں کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہمارے قابل قدر اسلاف نے وحی وسنت کی روشنی میں فکرورائے کی آزادی کا نہ صرف بہترین استعمال کیا بلکہ اپنی فکری وعلمی کاوشوں کے نتائج انسانیت کے لیے عام کیے تاکہ خلق خدا ان سے مستفید ہو۔

واقعہ ہے کہ دوسوچنے والے ذہن دومختلف انداز سے سوچتے ہیں۔لہٰذا نتائج میں اختلاف ہونا فطری امر ہے۔تاہم یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ فکرونظر کا تنوع ذہنی افق کووسیع کرتا ہے جس کے نتیجے میں سوچ بچار کے نئے دریچے وا ہوتے چلے جاتے ہیں اورغوروفکر کا سفرخوب سے خوب تر کی جانب جاری رہتا ہے۔سوچ بچار پر پابندی اورغوروفکر پر قدغن لگانے کا وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو بہتے صاف شفاف اورصحت بخش پانی کوروک دینے کا ہوتا ہے۔کچھ عرصے کے بعد اس میں تعفن کا پیدا ہونا لازمی ہے۔صالح اورتعمیری غوروفکر پر اگر پابندیاں عائد کردی جائیں اور نئے حالات میں قدیم انداز وطرز فکر پر ہی اصرار کیا جائے تولازماً اس کا نتیجہ فکری جمود کی شکل میں نکلے گا جومعاشرے میں فکری گھٹن کا سبب بنے گا۔

انسانی معاشرہ جامد (static) نہیں ہوتا ہے۔یہ مسلسل ارتقائی عمل سے گزرتا رہتا ہے۔وقفے وقفے سے نئے حالات سامنے آتے ہیں اور نئے مسائل سراٹھاتے ہیں۔حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ نئے مسائل کے حل میں تجزیاتی اوراجتہادی فکری قوت بروئے کارلائی جائے۔کلیدی طور پر یہ کام علماء کے کرنے کا ہے۔اوراسی وقت ہوسکتا ہے جب علماء مجتہدانہ قوت فکر کے مالک ہوں اوراس نہج پران کی تربیت ہوئی ہو۔نری جامد اور مقلدانہ ذہنی روش کے حاملین سے پرمغز فکری وعلمی حرکی قیادت کی توقع رکھنا

محض سراب ہے۔

بدقسمتی ہے کہ ہمارے معاشرے کا طبقۂ علماء جس کے ہاتھ میں قیادت ہے عمومی طور پر فکری اور علمی جمود و تعطل کا شکار ہے، مزید بدقسمتی یہ کہ وہ اس پر قانع ہے۔ ان کے ادارے وہ ذہن پیدا کرنا ہی نہیں چاہتے جو قدیم سرمایۂ علم وفکر پر مثبت تنقیدی نگاہ ڈال سکے، نئے پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ کر سکے اور قرآن وسنت کی روشنی میں غور وفکر کر کے حل تلاش کر سکے۔ کہیں ''اکابر پرستی'' کی فصیلیں اس کا راستہ روکے کھڑی ہیں تو کہیں ''سلف پرستی'' کا نازک احساس تقدس اسے آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے اور کہیں 'ذہن خراب ہو جانے' کا موہوم اندیشہ لکیر کا فقیر بنے رہنے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ ایک بڑے تعلیمی ادارے، کہ وسعت فکر ونظر جس کا طرۂ امتیاز ہے، کی انتظامی مجلس سے منسلک ایک بزرگ تھے جو اسی ادارے سے فارغ التحصیل بھی تھے۔ فراغت کے بعد انہیں ملک کے ایک دوسرے معروف تعلیمی ادارے سے مزید استفادے کا موقع ملا۔ وہاں کے مختصر عرصۂ قیام میں ان پر اس ادارے کی مخصوص مقلدانہ فکری روش نے اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اول الذکر ادارے کے نصاب تعلیم سے وہ 'بدایۃ المجتہد' نکلوانے کے لیے برابر کوشاں رہے کیونکہ 'اس سے طلبہ کا ذہن خراب ہوتا ہے۔' اس جامد فکری ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اکیسویں صدی کے غیر منصوص اور اجتہادی معاملات میں نئے احوال وظروف کی روشنی میں ازسرنو غور کرنا اور حل تلاش کرنا ممنوع ٹھہراتے ہوئے مسائل کے حل کی جستجو بارہویں تیرہویں صدی کے علمی سرمایے میں کی جاتی ہے۔ کسی قدر فرق آیا ہے تو یہ کہ پرانے اقوال وآراء کو نئی لفظیات اور اسلوب میں بیان کیا جا رہا ہے، اور بس۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ گزشتہ ادوار کا فکری وعلمی سرمایہ آج کے لیے قابل اعتناء نہیں رہا۔ یہ قیمتی سرمایہ اب بھی بھرپور طریقے سے قابل استفادہ ہے۔ ان کے مطالعے سے ہمیں بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ ماضی میں قابل قدر علماء وماہرین نے اپنے اپنے ادوار میں پیش آمدہ فکری ومعاشرتی مسائل کو کن کن زاویوں سے سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور کن پہلوؤں کو اہمیت دیتے ہوئے ممکنہ حل تجویز کیے۔ غرض معاشرتی مسائل کو مختلف پہلوؤں سے سمجھنے کے طریقۂ کار (methodology) کا مطالعہ ان کے فہم وتجزیے کا بہترین اور مؤثر ذریعہ (tool) ہے۔ قدیم فکری وعلمی سرمایے سے بے نیازی برتنا اور انہیں ناقابل اعتناء سمجھنا، جیسا کہ بعض بزعم خود دانشوروں کا رویہ ہے، ذہنی وفکری افلاس کی دلیل ہے۔ ان کی نام نہاد دانشوری فی الحقیقت ان کے مخصوص فکری آقاؤں کے افکار کی جگالی ہے۔ دانشوری کے پیکر میں دوسروں کا ذہن وزباں لیے پھرنا آج ہنر بنا ہوا ہے۔

ایک پہلو اور ہے جو توجہ چاہتا ہے۔ ہمارا ماضی کا بیشتر علمی وفکری سرمایہ اس دور کی پیداوار ہے جب معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی پہلو سے اسلام حالت غلبہ میں تھا۔ بجز تجارت، دعوت وتبلیغ یا جنگ کے، اہل

ایمان سرزمین کفر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ان کی غالب اکثریت دارالاسلام کی حدود میں فروکش تھی۔یہی حال اہل کفر کا تھا۔ان کی معمولی اقلیت ہی بلاد اسلام میں مقیم تھی۔لہٰذا اس دور میں وجود میں آنے والے فکری،علمی اور فقہی سرمایے پر مجموعی طور پر اسلام کے معاشرتی اور سیاسی غلبے یا کم از کم تہذیبی غلبے کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔ایسا ہونا فطری تھا۔اب صورت حال یکسر مختلف ہو چکی ہے۔کرۂ ارض کا غالب حصہ معاشرتی طور پر تکثیری (pluralistic) ہے۔اس نئی معاشرتی صورت حال کا فطری تقاضہ ہے کہ غیر منصوص اور اجتہادی معاملات میں از سر نو اجتہاد فکر و نظر کی طرح ڈالی جائے۔قدیم سرمایہ اپنی افادیت کے باوجود تنہا نئی صورت حال سے نمٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ سوچنے کے عمل کے نتیجے میں اختلافات بھی نمودار ہوں گے۔ایسا ہونا فطری ہے۔لہٰذا ان کے نہ ہونے کی تمنا،تمنائے خام ہے۔البتہ اختلاف کی شدت ضرور کم کی جاسکتی ہے،اگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بصیرت افروز قول سامنے رکھ لیا جائے:

''میری رائے درست ہے اور میرے حریف کی غلط،تاہم اس کے صحیح ہونے کا احتمال بھی ہے۔ میرے حریف کی رائے غلط ہے اور میری درست،تاہم اس کے غلط ہونے کا احتمال بھی ہے۔''

امام موصوف کی یہ عبارت ایک کثیر الاشاعت سیکولر اور لبرل عربی ہفتہ وار کے سرورق کی عرصے تک زینت بنتی رہی۔ چراغ ہمارا اور گھر دوسرے کا روشن۔کیا قیامت ہے!

پروفیسر اشتیاق دانش،شعبہ اسلامک اسٹڈیز،جامعہ ہمدرد،نئی دہلی۔موبائیل نمبر: 09871991729

آزادئ رائے یا اظہار مافی الضمیر کا حق ہمیشہ ایک نازک مسئلہ رہا ہے۔یہ طے کرنا مشکل رہا ہے کہ رائے کی آزادی کی حدیں کیا ہیں اور کن سرحدوں کو عبور کر جائیں تو آزادئ رائے دل آزاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک مسئلہ رہا ہے کہ ان حدوں اور سرحدوں کو طے کون کرے۔ چونکہ خدا نے یہ خوبصورت دنیا بہ ایں معنی نامکمل بنائی ہے کہ ہماری صلاحیتیں بہت سے مسئلوں کو حل کرنے سے قاصر ہیں،اس لیے آزادی رائے کے مسئلہ کو بھی ہم ایک مسئلہ سمجھ کر بات آگے بڑھاتے ہیں،جس پر عدم اتفاق ناگزیر اور اجماع ناممکن ہے۔

آزادئ رائے لازمی طور پر اختلاف رائے کو جنم دیتی ہے۔اختلاف رائے کو ہم بالعموم غلط سمجھتے ہیں۔یہ اختلاف برائے اختلاف نہیں بلکہ دوسرے احباب واصحاب سے کسی مسئلے پر مختلف الرائے ہونا

ہے۔ میں آپ سے مختلف الرائے ہونے کی وجہ سے آپ کا دشمن نہیں ہو جاتا۔ بعض علماء اختلاف رائے کو اپنی کم علمی کی دلیل سمجھ بیٹھتے ہیں جو محض نادانی نہیں بلکہ بدقسمتی ہے۔ اس قسم کے رویوں سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

تخلیق آدم کے مسئلے پر فرشتوں نے اللہ تعالی سے مختلف رائے کا اظہار کیا۔ کیا فرشتے نعوذ باللہ نافرمان تھے۔ ظاہر ہے اللہ تعالی نے ان فرشتوں کو سزا نہیں دی جنہوں نے باری تعالی سے اختلاف رائے کی جرأت کی تھی۔ اللہ تعالی کی طرف سے بھی شدت غضب کا اظہار نہیں ہوا بلکہ جو جواب باری تعالی کی طرف سے سامنے آیا اس میں تحمل، متانت اور شرافت نفسی جیسے اوصاف جھلکتے ہیں۔ اللہ تعالی کی کئی اور صفات سے یہ ظاہر ہوتا یا یہ سبق ملتا ہے کہ اختلافی مسائل میں ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ قرآن مجید میں قصص خاص مقصد سے بیان کئے گئے ہیں۔ تخلیق آدم کے تعلق سے اللہ تعالی اور فرشتوں کے درمیان ہوئے ڈائیلاگ کا مقصد آزادیٔ رائے کی اہمیت کو واضح کرنا اور سلیقے سے اختلافِ رائے کو برتنا ہے۔

وامرہم شوریٰ بینہم ایک بہت بڑا معاشرتی وسماجی اصول ہے۔ باہم مشورت جب بھی ہوگی تو ایک سے زائد مشورے سامنے آئیں گے ہی۔ اگر ہم اپنی معاشرتی اور سماجی زندگی کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو باہمی مشاورت کے اصول کو اختیار کرنا ہوگا، اور باہمی مشاورت کا اصول کامیاب اسی وقت ہوگا جب ہم آزادیٔ رائے کے حق کو تسلیم کریں گے۔ آزادیٔ رائے کے حق کو کیسے استعمال کیا جائے، کہاں تک آزادیٔ رائے، آزادیٔ رائے ہے اور کس نشان کو پار کر جانے کے بعد دل آزاری ہے، اظہار مافی الضمیر کا طریقہ وسلیقہ کیا ہے، اختلاف رائے کے آداب کیا ہیں یا اصول کیا ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جو کم وبیش ہم پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ انہیں کیسے طے کیا جائے اور کیسے ہم انہیں اپنی زندگیوں میں برتیں۔

علماء ورثۃ الانبیاء ہیں، اور علماء سے مراد لازمی طور پر فارغین مدارس نہیں ہیں بلکہ وہ افراد مراد ہیں جو قرآن وحدیث میں گہرا درک رکھتے، اور تعلیماتِ اسلامی کی روشنی میں زمانے کو سمجھتے اور صحیح اسلامی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں صحیح اسلامی فکر رکھنے والے دانشوران علماء کہلانے کے مستحق ہیں، چاہے ان کی تعلیم وتربیت مدارس میں ہوئی ہو یا عصری دانش گاہوں میں یا کہیں اور۔

ورثۃ الانبیاء کا رتبہ عظیم الشان ہے اور اس سے علماء پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انبیائی مشن کو قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح طریقے سے سمجھیں۔ اکثر پتہ نہیں چلتا کہ کب فہم کج روی کا شکار ہو گیا یا غلط راستے پر چل پڑا۔ اس لیے ضروری ہے کہ دانشورانِ قوم یا علماء

ہر مسئلے اور نکتے پر کافی غور وخوض کریں اور سلسلے میں ہونے والے عام اختلافات کو گوارا کریں تا کہ کسی بھی موضوع بحث کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہے اور صحیح اسلامی پوزیشن لوگوں کے سامنے آ سکے۔

ایک تلخ حقیقت کا اعتراف علماء ہند کو کر لینا چاہئے۔ علماء اور علماء مخالف افراد کو یہ غلط فہمی ہے کہ مسلم سماج پر ان کا اثر کافی گہرا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ بے شمار سیاسی وسماجی اور معاشی امور پر لوگ علماء کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بعض لوگ تو باقاعدہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے جائز و جائز کاموں کا علماء سے فتوی حاصل کرلیں۔ انگلینڈ کے ایک سفر کے دوران دیکھا کہ بعض بنگلہ دیشی تاجروں نے شراب کا کاروبار شروع کر رکھا ہے اور سوال کرنے پر بنگلہ دیشی علماء کا فتوی دکھاتے کہ چونکہ برطانیہ دارالحرب ہے، اس لیے مسلمان شراب کا کاروبار کر سکتے ہیں۔ اگر برطانیہ دارالحرب ہے تو شائد ہی کوئی ملک دارالاسلام کہلائے گا۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے میں محمد عبدہ کے اس قول کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں کہ ''جب میں یوروپ میں ہوتا ہوں تو مجھے ہر طرف اسلام نظر آتا ہے لیکن مسلمان نہیں۔ اور جب میں مصر میں ہوتا ہوں تو مجھے ہر طرف مسلمان نظر آتے ہیں اسلام نہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عامۃ الناس کے ساتھ علماء کی بھی ذمہ داری ہے کہ خواہشات نفس کے بجائے قرآن وحدیث کی اتباع کریں یا فتوی دینے سے پہلے نفسِ مسئلہ پر گہرائی سے غور کرلیا کریں۔ ورثۃ الانبیاء ہیں تو ذمہ داری بھی آپ کی اتنی ہی بڑی ہے۔ اپنی اس بڑی ذمہ داری کا احساس گہرا ہونا چاہئے۔

آزادیٔ رائے اور اختلاف رائے کے حق میں ماحول سازی کے لیے علماء کے رول سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مسلم معاشروں میں علماء کو اپنا رول ادا کرنے کے مواقع بھی حاصل ہیں۔ جمعہ کا خطبہ وہ اہم ذریعہ ابلاغ ہے جو کسی اور مذہبی قوم کو حاصل نہیں ہے۔ خطبۂ جمعہ کی اہمیت پر کافی کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اس اہم موقع یا ذریعۂ ابلاغ کا بہترین استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ کم ہی مساجد میں خطبے یا عربی خطبے سے پہلے مقامی زبان میں ہونے والی تقریریں تیر بہ ہدف کا کام کرتی ہیں۔ معاف کریں اکثر خطباء غیر ادبی، غیر مؤثر زبان میں کچھ باتیں کرتے ہیں، جنہیں لوگ دین کی باتیں سمجھ کر اس نیت سے سنتے ہیں کہ اس سے ثواب ملے گا۔ یہ بتانے کی یا اس اہمیت کو اجاگر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خطباء کو Relevant ہونا پڑے گا، یعنی لوگوں کو روزمرہ کی زندگی میں درپیش مسائل اور دشواریوں کا صحیح اسلامی حل ایسی زبان میں پیش کرنا ہوگا جو آسان، دل نشیں اور دلوں میں اتر جانے والی ہو۔ دل ودماغ کو اپیل نہ کرنے والی زبان اچھی باتوں کو بھی بے اثر بنا دیتی ہے۔

ہمارے عہد کا ایک زبردست انقلاب سوشل میڈیا ہے۔ الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر سرمایہ داروں اور کئی اور قسم کے اجارہ داروں کا قبضہ ہے، اس لیے شائد ہم ان کا استعمال بہتر طور سے نہ کر سکیں، لیکن ہم

ایسے غرباء اور بے اثروں کے لیے سوشل میڈیا نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں اور ضرورت ہے کہ ہم اس کا بہتر استعمال کریں۔ سچ یہ ہے کہ کافی بڑے پیمانے پر سوشل میڈیا کا استعمال مسلمان کرنے بھی لگے ہیں۔ بعض روایتی علماء بھی ماشاء اللہ میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں۔بعض نیک دل اور خدا ترس اللہ کے بندے بھی اسلامی تعلیمات کی ترویج واشاعت سوشل میڈیا کے ذریعے کرنے لگے ہیں۔لیکن بدقسمتی سے بعض لوگ اس میڈیم کو بھی مسلکی اختلافات کو ہوا دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں جونہایت افسوسناک ہے۔

زندگی اور مسئلوں کو چولی دامن کا ساتھ ہے۔کوئی بھی میڈیم اچھے اور برے مقاصد دونوں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے اور ہوسکتا ہے۔اور شاید ہمیں اب یہ بھی تسلیم کرلینا چاہئے کہ بعض علماء بھی ایک طرح کا مسئلہ ہیں، بلکہ بعضوں کی ''علمائیت'' ایک طرح کی ''معاشی سرگرمی'' ہے، وہ معاشی سرگرمی جو دراصل دنیا داری ہے۔ نیکی کے مقابلے میں برائی ہمیشہ دلکش اور پرلذت رہی ہے، اس لیے بعض لوگوں کو گمراہ ہونے سے روکنا شاید ممکن نہیں ہے۔دعا کے ساتھ کوشش ہونی چاہئے کہ پوری دنیا سدھر جائے،لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہت سے علماء اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے، آزادئ رائے کے حق کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو دینے کے حق میں ہیں۔ وہ ''مستند ہے جو میرا فرمایا ہوا ہے'' کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ایسے لوگوں کے لیے بس دعا ہی کرسکتے ہیں،لیکن مٹھی بھر وہ علماء جو مسلک سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں، آج کی دنیا میں ان کے لیے پہلے سے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ مسجد ومنبر اور خطبات جمعہ جیسے ذرائع حاصل نہ بھی ہوں تو سوشل میڈیا کے ذریعے وہ اپنی بات لوگوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں اور حتی المقدور ابلاغ وترسیل ہی آپ کی ذمہ داری ہے، دلوں میں ایمان کو اتارنا اللہ تعالی کا کام ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی،اسسٹنٹ پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،
ای میل:ziauddin.malik.falahi@gmail.com

آزادی رائے کس لیے؟ کیا آزادی رائے ضروری ہے؟ کیا تقلیدی رائے، رائے کے زمرے میں شمار ہوگی؟ تقلید واجتہاد سے حریت فکر کا کس قدر واسطہ ہے؟ خود حریت فکر کے حدود، شرائط اور آداب کیا ہیں؟ حریت فکر ونظر کی تشکیل وتفکیر میں علماء کیا تنہا محرک ہیں؟ علماء سے مراد کیا صرف فارغ التحصیل علماء ہیں یا سماجی وطبعی علوم اور سیکولر فنون کا ماہر بھی علماء کی فہرست میں داخل کیا جاسکتا ہے؟ اور

تکثیری معاشروں میں حریت فکر وعمل کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اور ان جیسے متعدد دیگر سوالات کے جلو میں چند سطریں حاضر خدمت ہیں:

آزادی خواہ فکر کی ہو یا عمل کی، یہ مشیت ایزدی اور خدائی تحفہ ہے۔ جبر واکراہ نامحمود اور مشیت میں دخل اندازی ہے۔ حریت فکر وعمل کے اصول وکلمات خدائی ہیں، البتہ ان کی جزئیات میں انسان کو ایجاد کا نہیں بلکہ اجتہاد واستنباط کا حق حاصل ہے۔ حریت فکر وعمل کے ایزدی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر وشر میں اختیار وترک کی آزادی عطا فرما کر جبر واکراہ کا خاتمہ کر دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱) وَلَوْ شَاء رَبُّكَ لآمَنَ مَن فِي الأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ۔ (سورہ یونس:۹۹)

۲) وَلَوْ شَاء رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ۔ إِلاَّ مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لأَمْلأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (ہود: ۱۱۸۔۱۱۹)

ان آیات میں فکر وعمل کی آزادی کو انسانیت کے وجود اور اس کے تنوع کا مدار قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حریت فکر وعمل نہ صرف یہ کہ لازمی اور ضروری عنصر ہے بلکہ خالق کائنات کے مقصد تخلیق انس وجن کو برتنے کی کسوٹی بھی ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ خود رائے کا کیا مفہوم ہے؟ کیا غور وفکر کا ہر مسئلہ رائے کے درجے میں آتا ہے؟ کیا زبان سے نکلے ہوئے تمام صیغے رائے کا مقام رکھتے ہیں؟ دراصل رائے دو مختلف کیفیتوں میں ایک کے ترک اور دوسرے کے قبول کرنے کی سلسلہ میں غیر فعلی یا نطقی کردار کا نام ہے۔ یا یوں کہیں کہ امر ونہی کے فرض منصبی کی انجام دہی میں جزئیات کے ضمن میں ابھرنے والے اس اختلافی منظر وپس منظر کا نام ہے جس کی شاہ کلید قرآن وسنت ہے، جس کی تعبیر وتشریح کا حق وارثین انبیاء یعنی علماء امت کو حاصل ہے جس میں فارغ التحصیل وغیر فارغ التحصیل کی بحث غیر علمی ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ علوم شرعیہ وغیر شرعیہ یا دینی ودنیاوی علوم کی تقسیم کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو بجا طور پر شرعی علوم کے ناقل اور شارح فارغ التحصیل علماء ہی ہوں گے۔ غیر فارغ التحصیل کی استثنائی صورت ہماری بحث سے خارج ہے۔

جیسا کہ ذکر ہوا، وارثین انبیاء کو ایجاد کا نہیں اجتہاد کا حق حاصل ہے "اجتھد برائی" کی نبوی تصدیق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا تقلیدی رائے کو وہ اعتبار حاصل ہوگا جو اجتہادی رائے کو حاصل ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ تقلید اور اجتہاد دونوں کے اندر ''رائے'' ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ رائے کو اگر ان دونوں مہتم بالشان فقہی کینوس سے ایک لمحہ

کے لیے خارج یا غائب کر کے دیکھیں تو تقلید واجتہاد کا سرسبز وشاداب میدان بنجر نظر آئے گا۔ چنانچہ دونوں طرح کی آراء قابل احترام ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ کی تان اجتہادی رائے پر ٹوٹتی ہے اور یہی اجتہادی فعل امت اسلامیہ کی تابناک تہذیب وتمدن کی ابدیت، حقانیت، کاملیت، فعالیت اور عملیت کی روشن دلیل بھی فراہم کرتا ہے۔ اسی مقام پر خود ''حریت وآزادی'' کی اہمیت وافادیت، حدود وآداب، نیز شرائط کی بحث کی بھی تفہیم ہوسکتی ہے۔ علماء مجتہدین کے اس مسئلہ پر آراء ومباحث کا خلاصہ اور نفس مسئلہ کی تفہیم یوں کی جاسکتی ہے کہ تقلید واجتہاد، دین ودنیا کی تعمیل وتسخیر کے لیے دو لازمی عناصر ہیں اور عالم اور عامی دونوں ان کے محتاج ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بشر تقلید پر مجبور بھی ہے کیوں کہ علم کا پہلا منبع ومبدأ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کے قلب اطہر پر الٰہی علوم ومعارف کا نزول وفیضان ہوا اور پھر درجہ بدرجہ ایک تقلیدی سلسلہ قیامت تک کے لیے دراز ہو چکا ہے۔ یہاں پر کسی کو یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ تقلیدی سلسلہ کی ناگزیریت سے اجتہادی عمل کی تنقیص ہو رہی ہے۔ دونوں کے اپنے اپنے دائرے ہیں اور دونوں دائرے ناگزیر ہیں، تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

حریت فکر کی بحالی اور سرپرستی میں علماء امت اسلامی نے ''الامر بالمعروف والنهی عن المنکر'' کے فرض منصبی کے تحت دینی خدمات انجام دی ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے بعد جن علماء نے حریت فکر ونظر کی توسیع میں پیش قدمی فرمائی، بیشتر کا تعلق عباسی عہد سے رہا ہے، جسے علوم وفنون کا سنہری عہد قرار دیا جاتا ہے اور جو تمدنی ضرورت کے لیے خود کفیل تھا۔ کیوں کہ اس عہد میمون میں علم آدم الاسماء کلّها (البقرہ:۵۳) کے تحت تسخیر کائنات کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جا چکا ہے۔ اس تفصیل سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عالم وہ ہوگا جو تمدنی ضرورتوں کا مدرک، معترف اور معرّف ہو اور کائنات کی تسخیر کے لیے بھرپور علمی وفنی ملکات کا حامل ہو۔ اس تعریف میں ''انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء'' کی لازمی شرط کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔ ورنہ ''غیبی دنیا اور اس کے اسباب وکوائف'' دائرہ علم وتحقیق سے باہر ہی رہیں گے جیسا کہ موجودہ ''سائنسی علماء'' کی علم وعرفان پر اجارہ داری کے نتیجہ میں یہ تحدید وتفریق ایک گمراہ کن مسلمہ اصول قرار پا چکی ہے۔ جس کی تبلیغ واشاعت کو ''فلسفہ جدیدیت کا فلسفہ'' اپنے وجود واحیاء کے لیے ریڑھ کی ہڈی تسلیم کرتا ہے۔

میری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ حریت فکر ونظر میں علماء (اپنے وسیع مفہوم میں) کی شراکت داری کا مسئلہ بہت نازک اور اہم ہے، کیونکہ راقم السطور کا خیال ہے کہ عالم وہ ہوگا جو عرفان وآگہی سے متصف ہو، جو مادی وروحانی اشیاء/ دنیا کا معترف ومعرف ہو، جو تمدنی ضروریات کی تسخیر کا ملکہ اپنے اندر رکھتا ہو، چنانچہ ایسے ہی فرد/ گروہ کو حریت فکر کے اختیار کرنے، دوسرے کے لیے اس کے اصول وآداب اور شرائط

کی وضاحت کرنے اور اس کی حفاظت ونگہبانی کی ذمہ داری تفویض کی جائے گی۔ یہی وہ تاریخی پس منظر ہے کہ علماء کرام نے تکثیری معاشروں کے اپنے زمانہ اقتدار میں دیگر اقوام اور تہذیبوں کے تنوع (Diversity) کو باقی رکھا۔ مسلم تاریخ میں حریت فکر ونظر اور کردار وعمل کی آزادی کا یہ وہ روشن باب ہے جس کی گواہی اور اعتراف میں دوست اور دشمن سب رطب اللسان ہیں۔

شمشاد حسین فلاحی، ایڈیٹر ماہنامہ حجاب اسلامی، نئی دہلی، موبائیل نمبر: 09990056137

آزادئ رائے انسانوں کے لیے ایک نعمت اور دین اسلام کا فضل خاص ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے امت کو عطا ہوا ہے۔ دین کا مزاج اس کی قدر کرتا ہے اور اسے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ چیز جس طرح افراد کے ذاتی معاملات اور امور دنیا میں قابل احترام ہے اسی طرح دینی امور میں بھی اس کی پوری گنجائش ہے۔ ہمارے دین اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اپنے ماننے والوں کو سوچنے اور عمل کرنے کا ایک وسیع دائرہ فراہم کرتا ہے اور اس دائرے میں عمل کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک گروہ کو اللہ کے رسول نے حکم دیا کہ وہ فلاں مقام پر پہنچ کر نماز عصر ادا کریں۔ لوگوں نے اپنی رفتار تیز کر دی کہ حکم رسول کے مطابق وہ وہاں پہنچ کر ہی نماز ادا کریں گے، لیکن راستے میں عصر کی نماز کا وقت ختم ہونے لگا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ رُک کر عصر کی نماز پڑھ لی جائے کہ وقت نکل رہا ہے اور نماز قضا کرنا دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ دوسرے کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے کہ اسی مقام پر نماز عصر ادا کی جائے گی، اس لیے وہ رسول اللہؐ کے اس حکم کی ہر حال میں تعمیل کریں گے۔ پہلے گروہ کا خیال تھا کہ رسول اللہؐ کی یہ ہدایت رفتار سفر کو تیز کرنے کی خاطر ہے، اور نماز قضا نہیں کی جائے، دوسرے نے اسے مطلق حکم رسولؐ تصور کیا اور خیال کیا کہ اس کی تکمیل لازم ہے، خواہ نماز قضا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے وقت کے اندر ہی اس مقام سے پہلے نماز پڑھ لی جبکہ دوسرے گروہ نے اس مقام پر پہنچ کر ہی قضا نماز پڑھی۔ اللہ کے رسولؐ کو جب علم ہوا تو آپؐ نے کسی پر نکیر نہیں فرمائی، اور دونوں گروہوں کی ستائش فرمائی۔ یہ آزادئ رائے کا ایک واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ اس کی کس قدر اہمیت ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ آزادئ رائے کے حدود کہاں تک ہیں۔ اس قسم کے بے شمار واقعات تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

فقہاء کی ضخیم کتابیں اور فقہی مکاتب فکر اسی آزادیٔ رائے کا مظہر اور اس کی علامت ہیں۔ ان مکاتب فکر کی وہی خصوصیت ہے کہ وہ ایک وسیع دائرۂ عمل کے درمیان سے متعین راہ کی نشاندہی اُن عوام الناس کے لیے کرتے ہیں جو دین میں تفقہ اور علم دین کی قلت کے سبب وسیع تر دائرۂ عمل سے ناواقف ہیں۔ یہ ایک سہولت تھی جو قدماء نے امت کے سامنے مسائل دین کو پیش کرنے اور اس پر عمل کرنے کی خاطر پیش کی، لیکن بعد کے ادوار میں ہماری فکری پسماندگی، علم دین کی کمی اور دینی امور میں دین سے عملی وابستگی کی کمزوری اور دین سیکھنے کی حرص کے فقدان نے امت کے عوام تو کیا خواص تک کو کاسہ لیس بنا دیا، اور کل حزب بما لدیھم فرحون کے مصداق انہیں محض فقہی تنگ نائیوں میں قید کر دیا۔ یہ امت کا بڑا خسارہ تھا، اس نے امت کے افراد سے نہ صرف دین کا وسیع تر تصور کم کر دیا بلکہ انہیں تنگ نظر، کم علم اور فکری اعتبار سے پژمردہ کر دیا۔

امت کو اس صورتحال سے نکالنے میں کلیدی رول علماء دین ہی ادا کر سکتے ہیں، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ خود دین کی فراہم کردہ وسعتوں کو سمجھیں، فقہی مکاتب فکر کا احترام کرتے ہوئے یہ سمجھ لیں کہ ان کی تعیین اشاعت اسلام کے اُس دور کے کافی بعد ہوئی ہے، جب رسول اللہؐ امت کو دین سمجھا رہے تھے اور قرآن مجید انسانوں کی ضرورت کے مطابق جستہ جستہ نازل ہونے کے بعد مکمل ہو چکا تھا۔

کتنی عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ پوری فقہ اسلامی کا سرمایہ جس کی بنیاد ہی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کی توسیع تھا، اسے آزادیٔ فکر و عمل کو محدود و مقید کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ اسلام اور کفر کا فیصلہ اور حلال و حرام کا حکم اسی کمزور بنیاد پر صادر کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے لازم اور ضروری ہے کہ علماء دین خود تفقہ فی الدین حاصل کریں اور تفہیم مسلک کے بجائے تفہیم دین کو اپنا مقصد بنائیں، توحید امت اور اتحاد بین المسلمین بھی اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین غازی، ہیڈ آف ریسرچ، دارالشریعۃ، متحدہ عرب امارات، ای میل: mohiuddin.ghazi@gmail.com

غور وفکر کا ماحول اور رائے کے اظہار کی آزادی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھی ضروری ہے، اور اسلام سے متعلق غلط تصورات کا صفایا کرنے اور صحیح تصورات کو دریافت کرنے اور انہیں عام کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی رائے پر پابندی ہمیشہ دشمنان حق کی طرف سے عائد کی گئی، پیغمبروں نے ہمیشہ انسان کو غور و فکر پر ابھارا، اور اپنے

غور وفکر کے نتیجہ میں خود اپنی رائے بنانے اور اس رائے کا اظہار کرنے کی دعوت دی۔

واقعہ یہ ہے کہ جس فریق کا موقف دلائل کے لحاظ سے کمزور ہوتا ہے وہ دلائل کی بجائے ظلم وجبر اور قید وبند کے راستے کو اختیار کرتا ہے، اور جو دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہوتا ہے وہ رائے کی آزادی کا علم بردار ہوتا ہے۔ یاد رکھیں کہ آزادی رائے دینے والوں میں بھی جن کا موقف جتنا زیادہ کمزور ہوتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ رائے کی آزادی کو شرطوں سے بوجھل کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیتیں ایسا مومن تیار کرتی ہیں، جو پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ سارے انسانوں سے اپنے موقف کے درست ہونے پر گفتگو کر سکے، بین المذاہب ڈائیلاگ میں بے خطر شریک ہو اور دلائل کی معرکہ آرائی میں ہمیشہ فاتح وکامران رہے۔ اس کے کسی رویہ سے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ دلائل کی جنگ سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے، اور اپنی بات کسی لالچ اور ترغیب یا زبردستی اور ترہیب کے راستے منوانا چاہتا ہے، مومن کی اصل قوت اس کے دلائل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ترغیب وترہیب بھی ہے، لیکن اس کا مقصد عقل کی آواز کو دبانا نہیں بلکہ عقل پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے کو چاک کرنا، اور دلائل سے بے خبر سوتے ہوئے انسان کو جھنجھوڑ کر جگا دینا ہے، کہ غور وفکر کے لئے بیداری شرط اولین ہے۔

قرآن مجید کا مومن کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا جس سے ظاہر ہو کہ اسے معرکہ استدلال میں اپنے موقف کے شکست کھا جانے کا اندیشہ ہے، وہ اپنے موقف کی حفاظت کے لئے کسی سزا کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اور نہ دوسروں کی تبلیغی کوششوں پر پابندی کی ضرورت۔ وہ مذہب کی تبدیلی اور مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں آزادی کا سب سے آگے بڑھ کر مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ مکمل آزادی کے ماحول میں اسے اپنے موقف کی برتری اور دلائل کی قوت دکھانے کا پورا موقعہ ملتا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ تبلیغ کی اس آزادی اور گفتگو کے اس موقعہ سے اس سے زیادہ فائدہ کوئی اور نہیں اٹھا سکتا۔ لالچ اور خوف کے راستے مذہب کی تبلیغ اور تبدیلی پر پابندی کی تجویز کا سب سے بڑا حامی اور مؤید وہ ہوتا ہے کیونکہ اپنے موقف کے دلائل کی قوت پر سب سے زیادہ اعتماد اور یقین اسی کو ہوتا ہے۔

امت کا کوئی گروہ آزادی رائے کا حقیقی علم بردار اسی وقت بن سکتا ہے جب دین کے ہر باب میں اس کا موقف طاقتور اور مضبوط دلائل پر قائم ہو، کمزور موقف کا حامل گروہ آزادی رائے سے فطری طور پر خوف زدہ ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں علماء کے لئے دو محاذوں پر فوری توجہ دینا ضروری ہے، ایک یہ کہ دین کے متعلق ہر باب میں قوی تر موقف تک رسائی حاصل کی جائے، چونکہ امت میں پہلے سے دین کے متعدد ابواب میں

اختلافی اقوال موجود ہیں، اس لئے کمزور موقف کو چھوڑ کر مضبوط موقف کو اختیار کرنا زیادہ مشکل امر نہیں ہے، یوں بھی مختلف اقوال کی موجودگی اس کا واضح قرینہ ہے کہ اپنے موقف پر نظر ثانی کی اور قوی تر موقف اختیار کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

دوسرا محاذ یہ ہے کہ امت میں خاص طور سے اور سارے انسانوں کے درمیان عام طور سے غور وفکر کا ماحول پیدا کریں، حقیقی دلائل کو اپنی رائے کی بنیاد بنانے کے رجحان کو عام کریں، اسلاف کی تقلید اور جماعت کی رائے کے از خود دلیل بن جانے کے رجحان کو روکیں۔ اور دنیا کو پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ اپنے علمی وفکری رویے سے باور کرائیں کہ ہمیں اپنے موقف کی قوت پر پورا یقین ہے، قوموں اور تہذیبوں کی سطح پر گفتگو کو تازہ دم رکھیں اور اپنے موقف کی ترجمانی کے لئے ہمیشہ سامنے رہیں، اور کبھی کمزوری نہ دکھائیں۔

ان دونوں محاذوں پر بیک وقت کام کرنا ضروری ہے، اور ان دونوں ہی محاذوں پر مطلوبہ رول کو بہتر طریقے سے انجام دینے کے لئے علماء دین کو صحیح سمت میں سخت جدوجہد کرنا ہوگی، اپنے اندر آزاد تحقیقی مزاج کو پروان چڑھانا ہوگا، صرف فقہی مسائل میں نہیں بلکہ مختلف میدانوں میں تقلیدی رجحانات امت کے ذہن ودماغ میں رچ بس گئے ہیں، ان سب کی جگہ اجتہادی روح کو جگہ دینی ہوگی، اور سب سے اہم یہ کہ عوامی سطحیت سے اوپر اٹھ کر علم کے بلند مقام کی طرف منتقل ہونا ہوگا، میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ جو اجتہاد کی بات کرتے ہیں وہ اپنی کتابوں اور مضامین میں کم سے کم علمی معیارات کا بھی خیال نہیں کر پاتے، یہ کوتاہی اجتہادی رجحان کی بدنامی کا سبب بنتی ہے۔ علمی اور تحقیقی مباحثوں اور گفتگوؤں میں دشنام طرازی اور تہمت اندازی سے پرہیز بھی لازم ہے۔ تحقیق کے ساتھ تعلق کو ہمیشہ معروضی اور غیر جانب دارانہ رکھنا ہوگا، اور ان سب پر مزید یہ کہ دوسروں کی بات بغور سننے کا ظرف اور دوسروں کو اپنی بات سلیقے سے سنانے کا فن بھی اپنے اندر امتیازی طور سے پیدا کرنا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ امت کو کمزور دفاعی موقف سے نکال کر طاقت ور اقدامی موقف میں لانے کا فریضہ پہلے درجے میں علماء دین پر عائد ہوتا ہے، اور وہ اس فریضہ کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس قرآن مجید جیسی محکم کتاب اور سنت جیسا روشن راستہ ہے۔

اشتیاق عالم فلاحی، دوحہ، قطر، ای میل: i_falahi@yahoo.com

اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ آپ ؐ کی

ذات کے گرد بے پایاں محبت وعقیدت کے ساتھ جمع ہوئے تھے،ان کی وحدت اوران کے اتحاد،اورمشن کے راستے میں متحدہ جدوجہد کوقرآن بنیان مرصوص قرار دیتاہے۔صحابہ کرامؓ کی اس انجمن کی فکری تربیت کا سلسلہ جاری رہے،اس کے لیے کہا گیا کہ وَشَاوِرھُم فِی الأمرِ (دین کے کام میں ان کوشریکِ مشورہ رکھو)۔ یہ انجمن ہے،اس انجمن کا شیرازہ منتشر نہ ہواس کے لیے دستور زباں بندی سودمند نہ ہوگا، بلکہ ان کو معاملات میں شریک مشورہ رکھو، وہ کھل کر اظہار کریں، سوچیں، راہیں تلاش کریں اور تجاویز پیش کریں۔پیش آمدہ مسائل پر سب لوگ غور کریں اور جتنے بھی امکانات ہوسکتے ہیں ان سب کوسامنے لایا جائے،ان پر تبادلہ خیال اوراس کے بعد مناسب ترین فیصلہ کے مطابق اقدام کیا جائے۔اس سے گھٹن اور بے چینی کے بجائے،اطمینان کے ساتھ منزل کی طرف لوگوں کے قدم اٹھیں گے۔

غزوۂ بدر سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوابوسفیان کے قافلے کی خبر دی گئی۔پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ تو بچ کر مکہ کے راستے میں نکل چکا ہے لیکن قریش کا وہ لشکر جو قافلے کی حفاظت کے لیے مکہ سے نکلا تھا واپس جانے کے بجائے آمادۂ جنگ ہے۔اس صورتحال میں رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ابوبکر،عمراورمقداد رضی اللہ عنہم نے اظہار خیال کیا،انصار میں سے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گفتگو رکھی۔آپ نے کئی بار صحابہ کرامؓ سے کہا کہ لوگو اپنی آراء پیش کرو۔رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ سے تفصیلی گفتگو کی اور پھر جنگ کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا گیا۔یہ مشاورت دراصل رسول اللہؐ کی طرف سے صحابہ کرامؓ کی تربیت تھی،آزادیٔ اظہار کی تربیت۔مشاورت اسلامی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے اور رائے کی آزادی مشاورت کا لازمی عنصر۔غزوۂ بدر کے موقع پر ایک بار عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔رسول اللہؐ نے عبداللہ بن رواحہ کی بات توجہ سے سنی اور ان کی رائے کو پسند فرمایا۔میدان بدر میں جب پڑاؤ کا مرحلہ آیا تو حباب بن منذر نے آگے بڑھ کر ایک دوسرا مقام تجویز فرمایا۔آپؐ نے اسے پسند فرمایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

غور وفکر ایک ریاض ہے۔اس ریاض سے پیدا ہونے والے نتائج پوری آزادی کے ساتھ رکھے جائیں تو فرد کے اندر خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے،امکانات کے نئے دروازے کھلتے ہیں،جستجو کی نئی راہیں نکلتی ہیں اور پھر یہی اظہار اجتماعی شکل اختیار کرتا ہے تو ایسے فیصلے اور اقدامات سامنے آتے ہیں جسے ہر ہر فرد اپنی کوشش فکر کا نتیجہ سمجھتا ہے۔اگر اس ریاض فکر کے نتائج کا گلا گھونٹ دیا جائے تو فرد کے اندر گھٹن پیدا ہوتی ہے، ذہن کند ہونے لگتا ہے اور اجتماعی نظام پر اعتماد اٹھ جاتا ہے، پھر سازشوں اور فتنوں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ آزادیٔ اظہار پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اسلام کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کو ہر بیڑی اور زنجیر سے آزاد کرنے کے لیے آیا۔ معاشرے کے جو ستم رسیدہ اور کمزور لوگ تھے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا تو دوسری طرف ستم گرانِ قوم بھی اس حقیقت سے نا واقف نہ تھے۔ دعوتِ توحید کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشمکش اس وجہ سے بھی شدید تھی کہ یہ آزادی اور استبداد کے مابین کشمکش تھی۔ رسول اللہؐ کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "اِن اَحسَنتُ فَأَعِينُونِي وَاِن أَسَأتُ فَقَوِّمُونِي"، (اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرنا اور اگر میں غلط قدم اٹھاؤں تو تو مجھے ٹھیک کر دینا)۔

بعد کے ادوار میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امراء وملوک نے امت سے اظہارِ رائے کی آزادی کا یہ حق چھیننے کی ہمیشہ کوشش کی۔ امراء اور روساء کے غلط اقدامات پر نکیر کرنے اور راہ صواب کی تلقین کرنے والے قابلِ گردن زدنی ٹھہرے۔ استبداد کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امت بطور خاص اربابِ علم واقتدار آزادیٔ رائے کی اہمیت کا ادراک کریں۔ آزادیٔ رائے جو انسان کا بنیادی حق ہے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ امت کے غلبہ کے لیے نئی راہیں تلاش کی جاسکیں۔

اظہارِ رائے کی یہ آزادی قرآن وسنت کی حدوں کی پابند ہے۔ یہ پابندی کسی فرد یا حکمراں کی عائد کردہ نہیں بلکہ آزادی کی حد متعین کرنے کا اختیار اسی پیغام کو ہے جس نے انسانیت کو آزادی کا تحفہ عطا کیا۔ غور وفکر کے نتیجے میں ذہن جن نتائج تک پہونچتا ہے انہیں قرآن کی میزان پر پرکھا جائے گا۔ اظہارِ رائے کی آزادی کی وہ شکل جو خدا بیزاری کی دعوت دے، جو ناموسِ رسالت کو پامال کرے اور نظامِ دین کو مسمار کرے کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

آزادیٔ رائے کا استعمال امت کی شیرازہ بندی اور اس کے ارتقاء کے لیے ہو، پستی، پسماندگی، اور زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے ہو۔ آزادیٔ اظہار کے ساتھ ہی دوسروں کی آراء کا احترام ضروری ہے تاکہ فکری ریاض اختلاف وانتشار کی راہ پر لے جانے کے بجائے فکری اتحاد کی طرف لے جائے۔

سدید ازہر فلاحی، استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ شانتاپرم، کیرلا، ای میل:
sadeedazhar@gmail.com

آزادئ رائے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام امور میں ہر فرد کو سوچنے سمجھنے اور کوئی رائے اپنانے کی آزادی حاصل ہو۔ اس آزادی کا اظہار (Manifestation) سب سے زیادہ

مذہب اور مذہبی معاملات میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے اس دنیا میں انسان کے لیے جو امتحان برپا کیا گیا ہے اس کی بنیاد سوچنے، سمجھنے، رائے قائم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی ہی ہے۔ یہ امتحان انسان کے عمل کا بھی ہے اور اس کے علم و عقل کا بھی۔ ''لیبلوکم اَیکم اَحسن عملا'' میں یہ دونوں چیزیں شامل ہیں۔ آزادئ رائے خدا کی اسکیم کا لازمی حصہ ہے۔ اس آزادی کو سلب کرنے کا اختیار خدا نے نہ کسی فرد کو دیا ہے اور نہ ہی کسی حکومت کو۔ اسی لیے قرآن نے کفر، شرک اور ارتداد کی کوئی دنیوی سزا نہیں بیان کی ہے۔ کسی شخص کا مذہب اسی وقت قدر و قیمت کا حامل ہوسکتا ہے جب وہ اسے بر بنائے آزادی اختیار کرے۔

انسانی تاریخ میں خدا کی عطا کردہ اس آزادی کو عام طور پر لوگوں نے سلب کر رکھا تھا۔ مختلف انبیاء نے جب اپنی قوموں کو حق کی طرف دعوت دی اور ان کی عقل و خرد کو مخاطب کیا تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ آباء و اجداد کے مذہب اور طریقے کو چھوڑ کر نہ ہم کسی دوسرے مذہب کو اختیار کر سکتے ہیں اور نہ ہی تم اس کا حق رکھتے ہو۔ چنانچہ ان انبیاء اور ان کے پیروؤں کو مذہبی جبر کے ماحول نکل کر آزاد ماحول کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ اسلام نے مذہبی جبر کے ماحول کو ختم کر دیا اور انسانوں کو آزادئ رائے کی ضمانت دی۔ قرآن نے لا اکـراہ فـی الـدیـن کہہ کر مذہب کے معاملے میں فطری جبر کی نفی کر دی۔ لہذا اس سلسلے میں کسی قانونی جبر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالی نے تمام انبیاء پر یہ بات واضح کی تھی اور اپنے آخری نبی سے بھی خطاب کر کے یہ واضح کر دیا کہ تم داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو(انـما أنت مذکر، لست علیهم بمصیطر) تمہارا کام لوگوں سے جبراً حق کو منوانا نہیں ہے(أفأنت تکره الناس حتی یکونوا مؤمنین) بلکہ حق کا اعلان کر دینا ہے(وقل الحق من ربکم فمن شاء فـلیـؤمـن ومـن شـاء فـلیـکـفـر)۔ اس کے بعد لوگوں کو آزادی ہے کہ جس بات کو وہ صحیح سمجھیں، اختیار کریں۔ اسلام نے جس چیز کی ضمانت پہلے دن سے دی تھی اسے جدید دور میں کئی جنگوں اور انقلابات کے بعد اور فکر و فلسفے کی کئی وادیوں کو طے کرنے کے بعد انسانوں نے عالمی سطح پر بنیادی انسانی حق کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

امت مسلمہ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس وقت آزادئ رائے کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ مسلم ممالک میں آمریتوں اور خاندانی بادشاہتوں کا بول بالا ہے۔ جمہوریت کے لیے ان ممالک میں کوئی جگہ نہیں ہے جس کے نتیجے میں وہاں آزادئ رائے اور آزادئ اظہار دونوں پر پابندی ہے۔

آزادئ رائے کے سلسلے میں ملت اسلامیہ ہند و پاک کی صورتحال بھی نہایت تشویشناک ہے۔ یہاں ہر مسلک اور ہر طبقے کے علماء اپنے پیرووں کو دیگر مسالک اور جماعتوں کی چیزیں نہ پڑھنے دیتے

ہیں اور نہ آزادانہ غور وفکر کرنے اور رائے قائم کرنے دیتے ہیں۔علماء کے ایک بڑے طبقے نے عوام کو قرآن سے دور کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب صرف ماننے کی چیز بن کر رہ گیا ہے، سمجھنے اور سمجھانے کی چیز نہیں۔

قرآن نے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نبی داروغہ نہیں ہوتا۔مگر انبیاء کے وارث علماء خود کو داروغہ سمجھتے ہیں۔وہ بالجبر لوگوں کو ہدایت پر چلانا چاہتے ہیں۔وہ عقیدے کے محافظ بن بیٹھے ہیں۔جن چیزوں کو وہ گمراہی سمجھتے ہیں ان کا سد باب دلائل کے زور سے نہیں بلکہ جذباتیت، اشتعال انگیزیوں، فتووں اور غلط پروپیگنڈوں کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔وہ ڈائیلاگ اور مذاکرے کے قائل ہی نہیں ہیں۔علماء دعاۃ کے بجائے قضاۃ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔شخصیات سے غالی عقیدت، فقہی ومسلکی جمود اور جماعتی و گروہی تعصب نے آزادیٔ رائے کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ہمارے دینی مدارس میں پہلے دن سے یہ طے کر دیا جاتا ہے کہ طالب علم حنفی ہوگا یا شافعی یا اہل حدیث۔ہمارا عالم اس زعم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ پڑھ لیا اور سیکھ لیا، وہی آخری درجہ میں حق ہے۔وہ اپنی غلطی کے امکان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔اس صورت میں وہ دوسروں کے لیے آزادیٔ رائے کا قائل کیونکر ہوسکتا ہے۔

یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں آزادیٔ رائے کا حق عوام ہی سے نہیں بلکہ علماء سے بھی سلب کر لیا گیا ہے۔ہمارے مذہبی علوم میں جمود کی یہی وجہ ہے۔روایتی علماء کسی نئی چیز پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔علمی بحث وتحقیق میں انہیں حق کی پرواہ کم ہوتی ہے اور لوگوں کے رد وقبول کی فکر زیادہ۔محقق علماء ہمارے سماج میں معتوب ہوتے ہیں۔قرآن وسنت کے علاوہ بہت ساری چیزیں ہیں جو ہمارے یہاں تقدیس کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ہمارے یہاں کسی رائے کے قابل قبول بلکہ واجب الاتباع ہونے کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ اس کے حق میں قدیم علماء کے دس بیس اقوال جمع کر دیے جائیں۔ہمارے سماج میں آزادیٔ رائے کو curtail کرنے کی بہت سی صورتیں رائج ہیں۔اہل علم کے دلائل کے جواب میں سلف اور متقدمین کا حوالہ دے کر چپ کرا دینے کی کوشش کی جاتی ہے، ان کی تحقیقی آراء کو تفردات کا نام دے کر ان کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ہر چھوٹے اور بڑے مسئلہ میں اجماع امت کا بے سروپا دعوی کر کے علمی تحقیقات پر قدغن لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ان سب حربوں کے باوجود کوئی کامیابی نہیں ملتی تو محقق علماء کے خلاف اشتعال انگیزی کی جاتی ہے، عوامی جذبات کا استحصال کیا جاتا ہے، ان کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں، ان کی شخصیت کو مجروح کیا جاتا ہے اور ان کی تحقیقات کو گمراہی اور فتنہ قرار دیا جاتا ہے۔اس ماحول میں بہت کم علماء اور مفکرین ہیں جو ان مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں اور نئے علمی معرکے سر کرتے رہتے ہیں۔مگر

سوچنے سمجھنے والوں کی بڑی تعداد دوہری پالیسی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ سوچتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ ہیں۔ آزادیٔ رائے کا ماحول اگر نہ ہو تو اسی طرح کی منافقت جنم لیتی ہے۔

آزادیٔ رائے کے بغیر فکر تازہ پیدا نہیں ہو سکتا، علمی جمود نہیں ٹوٹ سکتا اور عروج اور ترقی کی راہیں نہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا آزادیٔ رائے کے سلسلے میں ماحول سازی کی سخت ضرورت ہے۔ سب سے پہلے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کھلے ذہن کے علماء پیدا ہوں جو مسلکی و گروہی تعصّبات سے بالاتر ہو کر علم کے سچے خادم بنیں۔ خدا کی خاطر حق پر قائم رہنے والے اور خدا کی خاطر حق کی شہادت دینے والے بنیں۔ اس سلسلے میں مدارس کے ذہین طلبہ کی ذہن سازی کی جانی چاہیے۔ مدارس کے نصاب میں قرآن مجید کو تمام شرعی علوم کے محور کے طور پر پڑھایا جانا چاہئے تاکہ مناظرہ بازی اور جدال کے بجائے غور و فکر اور بحث و استدلال کا قرآنی مزاج پیدا ہو۔ طلبہ کو جدید افکار و نظریات سے واقف کرایا جائے تاکہ ان کا ذہنی افق وسیع ہو سکے اور وہ جدید دور کے تقاضوں اور چیلنجز کو سمجھ سکیں۔ ان کوششوں کے ساتھ ہمیں اس حقیقت سے بھی باخبر رہنا چاہئے کہ زمانہ خود آزادیٔ رائے کے حق میں راستہ ہموار کر رہا ہے۔ علماء کو یہ جان لینا چاہئے کہ الناس علی دین ملوکھم کا دور ختم ہو گیا ہے۔ یہ مواصلاتی انقلاب کا دور ہے۔ یہاں انٹرنیٹ، بطور خاص سوشل میڈیا کے ذریعے علم بھی بٹ رہا ہے اور گمراہی بھی۔ انفارمیشن پر کنٹرول اب ممکن نہیں رہا ہے۔ صرف convince کرنے کا راستہ باقی ہے۔ کوئی شخص لوگوں کو صرف اپنے مسلک کی چیزیں پڑھنے تک محدود نہیں رکھ سکتا اور صرف اپنی یا اپنے اکابر کی رائیں ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ لوگوں کے سامنے زیادہ options پیدا ہو گئے ہیں۔ علماء کے سامنے اب ایک ہی راستہ ہے۔ وہ اپنی آواز کو اونچی کرنے کے بجائے اپنی دلیل کو مضبوط کریں۔ علماء اب بھی اپنا رویہ تبدیل نہیں کریں گے تو وہ جدید دور میں irrelevant ہو کر رہ جائیں گے۔

عمّار جاوید القصوری، جامعۃ الامام ریاض سعودی عرب، ای میل:
ammarjawedkhan@gmail.com

اسلامی تعلیمات کی رو سے آزادیٔ رائے کا حق انسان کے اختیاری حقوق میں سے نہیں ہے جن کا اگر وہ چاہے تو مطالبہ کرے اور چاہے تو چھوڑ دے، بلکہ اسلامی تعلیمات کے پیش نظر تو ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنی رائے کی آزادی کے حق کو بخوبی استعمال کرے اور اس کے ذریعے جس چیز کو وہ غلط سمجھے اس کا اظہار کرے اور جس کو صحیح سمجھے برملا اس کا اعلان کرے اور آزادی کے ساتھ لوگوں کو اپنی

رائے اور اپنے مشورہ سے آگاہ کرے، قطع نظر اس سے کہ کسی بات کا انکار یا کسی بات کی تصدیق دین ودنیا کے کسی بھی گوشے سے متعلق ہو، خواہ وہ معاشرتی مسائل سے متعلق ہو یا سیاسی ومعاشی۔ پیارے نبیؐ نے فرمایا: "أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر"۔ (أخرجه أبو داؤد فی الملاحم والترمذی فی الفتن)، یہ حدیث اس بات پر صریح دلالت کرتی ہے کہ آزادئ رائے کا حق استعمال کرتے ہوئے ہر بدی کو بدی اور ہر خوبی کو خوبی کا نام دینا اور اس کا اظہار کرنا کتنی عزیمت کا کام ہے اور پیارے نبیؐ نے اس حق کو استعمال کرنے پر کتنا زور دیا ہے۔ آزادئ رائے کے مفہوم اور اس حق کے استعمال سے خیر القرون اور خلافت راشدہ کے دور میں ہر خاص وعام واقف تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک قبطی آپؓ کے پاس فاتح مصر نیز حاکم مصر عمرو بن العاصؓ اور ان کے بیٹے کی شکایت لے کر آیا تو آپ نے دونوں کو بلوایا اور ان سے اس قبطی کو اس کا حق دلوایا، اور وہ تاریخی جملہ کہا کہ "متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا"، گویا اسلام میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، نہ امراء کو عوام پر، نہ مالداروں کو ناداروں پر، نہ طاقتوروں کو کمزوروں پر، ہر انسان مکمل طور پر آزاد ہے اور ہر شخص کو مافی الضمیر کے اظہار اور آزادئ رائے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ جب ہم سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ مختلف معاملات میں اور مختلف مواقع پر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی رائے اور مشورہ لے کر جاتے ہیں اور پیارے نبیؐ اس کو قبول بھی کرتے ہیں، اور تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ آپؐ نے ناگواری کا اظہار کیا ہو یا کوئی ایسی بات کہی ہو جس سے یہ احساس ہو کہ معمولی سے معمولی شخص کو بھی اس اختیار سے محروم کیا گیا ہو، وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کو غلط کہنے اور جس چیز کو صحیح سمجھے اس کی تصدیق کرنے کی آزادی اس سے چھین لی گئی ہو۔

باوجود اس کے کہ پیارے نبیؐ معصوم عن الخطا تھے اور ہمہ وقت اللہ تعالی کی تائید شامل حال رہتی تھی، آپؐ خود صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور آپ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "أنتم أعلم بأمور دنياكم"، جو بعد میں آنے والوں کے لیے اس بات کا درس تھا کہ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ دوسرے سے اس کی آزادئ رائے کا حق چھینے اور اس کی زبان وقلم پر پابندی لگائے۔

یہ تھا اسلامی تعلیمات میں آزادئ رائے کا مقام، اور اس قدر اہمیت کا حامل تھا دور نبوت اور دور صحابہ میں آزادئ رائے کا حق اور اس حق کا استعمال، لیکن آج صورتحال یہ ہے کہ بہت سے ایسے اصول وضوابط بنالئے گئے ہیں جن سے آزادئ رائے کے حق کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حق کو اس قدر محدود ومحصور کر دیا گیا ہے کہ صرف مخصوص لوگ ہی اپنی رائے کا اظہار کر سکیں اور وہ بھی ان اصول

وضوابط کے ساتھ کہ ماقبل تحریر شدہ کسی بات سے انکار یا کسی نکتے پر شبہہ کی گنجائش نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں، جس چیز کو صحیح کہا جاچکا ہے اسی کو صحیح اور جس کو غلط کہا جاچکا ہے اسی کو غلط کہنے کا حق آپ کو آج بھی حاصل ہے لیکن اس کو آزادئ رائے سے تعبیر کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔

اس کے علاوہ جبھی باہمی فتنہ کے ذرائع کے سدباب کو دلیل بنا کر تو کبھی تفرقہ وکشیدگی کے ذرائع کے سدباب کو حجت بنا کر آزادئ رائے کا حق سلب کیا گیا تو کبھی جابر وظالم حکومت کے آگے مصلحتوں کے باکو بلا قید وبند کھول کر آزادئ رائے کی بنیاد ڈھانے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کسی نے آزادئ رائے سے کام لیتے ہوئے کوئی نئی رائے یا کوئی جدید تحقیق پیش کی جو پچھلی تحقیقات سے کسی بھی طرح مختلف ہو یا کوئی نئی رائے پیش کرتی ہو تو اس کو علماء سلف کی شان میں گستاخی اور ان کی ناقدری کا نام دیا گیا اور اس کی شدید مخالفت کی گئی کہ دینی امور میں غور وفکر، مسائل کے باب میں عقل کے استعمال اور جدید تحقیقات کو بدعت کے زمرے میں رکھا گیا، انجام کار یہ ہوا کہ حکومتیں اور اہل حل وعقد تو مطلق العنان ہوتے گئے اور امت مسلمہ جمود وانحطاط کا شکار ہوتی گئی۔ چنانچہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، ہرنئی رائے اور جدید تحقیق پر کھلے ذہن سے غور کرنے کے لیے خود کو آمادہ کریں اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کریں، ان کو بتائیں کہ آزادئ رائے کا اظہار ان کا شرعی حق ہے اس کو استعمال کرنا ان کے لیے لازم ہے، لہذا وہ ہر معاملہ میں آزادی کے ساتھ غور وفکر کریں اور اس کے نتیجے میں جس رائے تک پہنچیں اس کا اظہار کریں، ان کو بتائیں کہ قرآں میں بے شمار مقامات پر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی عقل کا استعمال کریں اور آزادی کے ساتھ غور وفکر کریں۔ علماء کو خود بھی سمجھنا چاہئے اور دوسروں کو بھی سمجھانا چاہئے کہ محض زبان وقلم اور اس سے آگے بڑھ کو عقل وخرد پر تالے لگادینے سے امت کا اتحاد ممکن نہیں اور نہ ہی یہ قید وبند باہمی فتنہ وفساد اور تفرقہ وکشیدگی ختم کرنے کا ذریعہ ہے بلکہ یہ آزادئ رائے کا حق سلب کرنا ہے اور یہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے بالکل برخلاف ہے۔

آئندہ شمارے کا خصوصی موضوع

(۱) آئندہ شمارے کے لیے خصوصی کالم کا موضوع ''**بچوں کی تربیت کے لیے مطلوبہ لٹریچر: صورتحال اور امکانات**''، متعین کیا گیا ہے۔

(۲) اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر اپنے افکار وخیالات اس طرح ارسال کریں کہ **۱۵/ جولائی** تک ہمیں لازماً موصول ہوجائیں۔

(۳) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے **۲/ صفحات** سے زیادہ طویل نہ ہو۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۸)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ہیڈ آف ریسرچ دار الشریعہ متحدہ عرب امارات

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۱) أَلَدُّ الْخِصَامِ کا مفہوم

لفظ خصومۃ کے معنی ہوتے ہیں بحث ومباحثہ کے، جس میں جھگڑے کی کیفیت بھی کبھی شامل ہوسکتی ہے۔ فیروزآبادی نے لکھا ہے، الخُصومَۃُ: الجَدَلُ۔

قرآن مجید میں اس لفظ کے متعدد مشتقات استعمال ہوئے ہیں، جہاں مترجمین نے جھگڑنے کے لفظ سے ترجمہ کیا ہے، خود لفظ خصام کا ترجمہ بحث مباحثہ اور جھگڑے سے کیا ہے، جیسے:

أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ۔ (الزخرف:۱۸)

''کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث وحجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کرسکتی؟''۔ (سید مودودی)

''کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت بات نہ کرسکے (خدا کی) بیٹی ہوسکتی ہے؟''۔ (فتح محمد جالندھری)

''کہ کیا (وہ پیدا ہوئی ہے) جو زیوروں میں پلتی اور مفاخرت میں بے زبان ہے''۔ (امین احسن اصلاحی، لیکن یہاں مفاخرت کا ترجمہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس لفظ کے اندر مفاخرت کا مفہوم بالکل نہیں پایا جاتا ہے، صرف بحث تکرار اور جھگڑے کا مفہوم ہے)

مترجمین نے عموما خصام کا ترجمہ بحث وحجت اور جھگڑا کیا ہے، تاہم مندرجہ ذیل آیت میں جہاں لفظ أَلَدُّ الْخِصَام آیا ہے، بہت سارے مترجمین نے بدترین دشمن کا ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس لفظ میں دشمنی کا مفہوم نہیں پایا جاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ۔ (البقرۃ:۲۰۴)

''انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے، جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمھیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے''۔ (سید مودودی)

محمد حسین نجفی، علامہ جوادی، ، پیر محمد کرم شاہ نے بھی بدترین دشمن ترجمہ کیا ہے، جبکہ امین احسن اصلاحی نے کٹر دشمن ترجمہ کیا ہے۔ اشرف علی تھانوی کا ترجمہ ہے: حالانکہ وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے۔

وہیں بعض دوسرے مترجمین نے سخت جھگڑالو سے ترجمہ کیا ہے اور یہی ترجمہ درست ہے، جیسے:

''اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے''۔(فتح محمد جالندھری)

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے ترجمہ کے لئے وہ الفاظ اختیار کئے ہیں جو لفظ سے قریب ترین ہیں، ''درحقیقت وہ بہت زیادہ باتونی اور کٹھ حجتی کرنے والا ہے''۔

دراصل أَلَــدُّ الْــخِــصَـــامِ کا مطلب تو جھگڑا اور کٹھ حجتی کرنا ہی ہے، جیسا کہ طبری نے ذکر کیا ہے؛(وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ) أی ذو جدال اذا کلمك و راجعك۔

لیکن زمخشری نے لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے غالباً تفنن کلام کے طور پر عداوت کا بھی ذکر کر دیا، ان کے الفاظ ہیں:وَهُــوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ، وهو شديد الجدال والعداوة للمسلمين۔ اور لگتا ہے کہ یہاں سے بعض مترجمین اور مفسرین نے یہ خیال کیا کہ یہ لفظ سخت دشمن کے معنی میں ہے۔

(۲) خَصِيمٌ مُّبِيْن کا مطلب

لفظ خصیم مبین کا ذکر قرآن میں دو مقامات پر ہوا ہے، عام طور سے اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ یہ سمجھ کر کیا ہے کہ گویا دونوں مقامات پر ان کفار کی مذمت کی جارہی ہے جو اللہ سے جھگڑا کرتے ہیں۔

(۱)خَلَقَ الإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ۔ (النحل:۴)

''اُس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا''۔(سید مودودی)

''اس نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا پھر وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا''۔(محمد جونا گڑھی)

(۲)أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ۔ (یس:۷۷)

''یا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا۔ پھر وہ تڑاق پڑاق جھگڑنے لگا''۔ (فتح محمد جالندھری)

''کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا''۔(امین احسن اصلاحی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ دونوں آیتوں کا سیاق اللہ کی انسان پر نعمت بیان کرنے کا ہے، خَصِيمٌ مُّبِينٌ کا ترجمہ ہوگا:''بے تکلفی سے بحث کرنے والا''۔اور یہاں وہ کٹھ حجتی مراد نہیں ہے جو ایک منکر اللہ کی آیتوں کے ساتھ کرتا ہے، بلکہ بحث ومباحثہ کی وہ عام صلاحیت مراد ہے جو ہر انسان کو

حاصل ہوتی ہے۔یعنی جس انسان کی تخلیق ایک قطرے سے ہوتی ہے، وہ دیکھتے دیکھتے کلام اور مباحثہ کی کتنی گونا گوں صلاحیتوں کا حامل ہوجاتا ہے۔

یہاں عام انسانوں کے لئے خَصِيمٌ مُّبِين کی تعبیر اختیار کی گئی جبکہ دوسرے مقام پر عورتوں کے لئےوَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِين کی تعبیر اختیار کی گئی۔وہاں جس طرح بحث ومباحثہ میں عورتوں کی کمزوری کی طرف اشارہ ہے یہاں دونوں مقامات پر بحث ومباحثہ کے تعلق سے عام انسان کی قوت وصلاحیت کی طرف اشارہ ہے، جواللہ تعالی محض ایک نطفہ سے انسان کو پیدا کرنے کے بعد ایک عظیم نعمت کے طور پر عطا کرتا ہے۔اور جب انسان اپنی تخلیق کی ابتدا اور اپنی صلاحیت کو یکجا کر کے دیکھتا ہے،تو اس شدید استعجاب سے دوچار ہوتا ہے،جس کی تعبیر لفظ اذا فجائیہ سے کی گئی ہے۔

ان دونوں آیتوں کا ترجمہ شیخ الہند مفتی محمود الحسن نے کچھ اسی انداز سے کیا ہے:

''بنایا آدمی کو ایک بوند سے، پھر جبھی ہو گیا جھگڑا کرنے والا بولنے والا''۔

''کیا دیکھتا نہیں انسان کہ ہم نے اس کو بنایا ایک قطرہ سے، پھر تبھی وہ ہو گیا جھگڑنے بولنے والا''۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر کو ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے، زمخشری سورہ نحل والی آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

”فاذا هو خصيم مبين فيه معنيان، أحدهما: فاذا هو منطيق مجادل عن نفسه مكافح للخصوم مبين للحجة، بعدما كان نطفة من منيّ جمادا لا حس به ولا حركة، دلالة على قدرته۔ والثاني: فاذا هو خصيم لربه، منكر على خالقه، قائل: من يحيى العظام وهى رميم، وصفا للانسان بالافراط فى الوقاحة والجهل، والتمادى فى كفران النعمة۔“ (تفسير الكشاف)

(۳) ایمان لانے اور ایمان رکھنے کے محل کی رعایت

ایمان لانے کا مطلب ہوتا ہے غیر ایمانی حالت سے ایمان میں داخل ہونا، جبکہ ایمان رکھنے کا مطلب ہوتا ہے ایمان سے متصف ہونا۔عربی لفظ ایمان کا مطلب ایمان لانا بھی ہوتا ہے اور ایمان رکھنا بھی ہوتا ہے۔ میں اللہ پر ایمان لایا، اور میرا اللہ پر ایمان ہے یا میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں، دونوں تعبیروں میں فرق ہے۔

قرآن مجید میں لفظ ایمان اور اس کے مشتقات متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں، اور مذکورہ

دونوں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، کلام میں لفظ کا محل خود یہ طے کرتا ہے کہ کیا مراد ہے، ایک عام انسان جب ایمان کو قبول کر کے اس میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایمان لانا ہوتا ہے، اور جب ایک آدمی ایمان کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے تو یہ ایمان رکھنا ہوتا ہے، گویا جہاں اہل ایمان کے وصف کے طور پر بیان ہو وہاں ایمان رکھنا کہیں گے۔

ایک آیت سے اس کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے،

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْياً وَعَدْواً حَتَّى إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لا إِلَـهَ إِلاَّ الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَاْ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (یونس:۹۰)

''اور ہم بنی اسرائیل کو دریا پار لے گئے تو فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا سرکشی اور ظلم سے یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے آلیا بولا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا معبود نہیں، سوا اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمان ہوں''۔ (احمد رضا خان)

اس ترجمہ میں دونوں الفاظ کا ترجمہ ایمان لانے سے کیا گیا ہے، لیکن اگر یہ حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ فرعون ایمان میں داخل ہونے کا اعلان کر رہا ہے، جبکہ بنی اسرائیل پہلے سے ایمان والے تھے، تو ترجمہ اس طرح ہوگا۔

''اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر پار لے گئے تو فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا سرکشی اور ظلم سے یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے آلیا بولا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا معبود نہیں سوا اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں مسلمان ہوں۔''

انگریزی کے مندرجہ ذیل دو ترجموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ اول الذکر یعنی اسد کے ترجمہ میں اس فرق کا بڑی باریکی سے لحاظ کیا گیا ہے:

[Pharaoh] exclaimed:" I have come to believe that there is no deity save Him in whom the children of Israel believe. (Asad)

He exclaimed: I believe that there is no Allah save Him in Whom the Children of Israel believe. (Pickthal)

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کے ترجمے میں مترجمین نے اس فرق کا کہاں تک لحاظ کیا ہے، اس کا جائزہ بطور مثال مفید ثابت ہوگا۔

الـم۔ ذَلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُون۔ والَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُون۔ أُوْلَـئِكَ عَلَى هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (البقرۃ:۱۔۵)

''الف لام میم، یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے اُن پرہیزگار لوگوں کے لیے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں''۔(سید مودودی)

''یہ الم ہے۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے (کتاب الٰہی ہونے) میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔ (ان لوگوں کے لئے) جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں۔ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور (ان کے لئے) جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔(امین احسن اصلاحی)

عام طور سے مترجمین نے ان آیتوں میں (یُؤْمِنُون) کا ترجمہ ''ایمان لاتے ہیں'' کیا ہے، جبکہ سیاق کلام کا تقاضا ہے کہ ''ایمان رکھتے ہیں'' ترجمہ کیا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی سیاق میں (یُوقِنُون) کا ترجمہ عام طور سے مترجمین نے ''یقین رکھتے ہیں'' کیا ہے۔

مذکورہ آیات بالکل واضح ہیں کہ تذکرہ ان لوگوں کا ہو رہا ہے جن کے اوصاف میں ایمان شامل ہو چکا ہے، بلکہ ایمان کے ثمرات بھی ان کی شخصیت کا مظہر بن چکے ہیں۔

اکثریت کے برعکس بعض مترجمین نے خاص اس مقام پر اس کی رعایت کی ہے، ایک مثال پیش ہے:

''الف۔ لام۔ میم۔ یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس (کے کلام اللہ ہونے) میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ (یہ) ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے۔ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور پورے اہتمام سے نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (میری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے (سابقہ

انبیاء) پر نازل کیا گیا۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر (قائم) ہیں اور یہی وہ ہیں جو (آخرت میں) فوز وفلاح پانے والے ہیں''۔ (محمد حسین نجفی)

(۴) جُندُ مَّا هُنَالِکَ کا ترجمہ

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ۔ (ص:۱۱)

اس آیت میں ایک لفظ (هُنَالِكَ) ہے، جس کا ترجمہ لوگوں نے ظرف زمان یا ظرف مکان سے کیا ہے، کسی نے اسی جگہ اور کسی نے اس وقت کا ترجمہ کیا۔

اس آیت میں ایک دوسرا لفظ (مَا) ہے، جس کا ترجمہ بعض لوگوں نے چھوٹا اور بعض لوگوں نے بڑا کیا ہے۔

''یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اِسی جگہ شکست کھانے والا ہے''۔ (سید مودودی)

''یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے''۔ (فتح محمد جالندھری)

''یہ بھی (بڑے بڑے) لشکروں میں سے شکست پایا ہوا (چھوٹا سا) لشکر ہے''۔ (محمد جوناگڑھی)

''(کفّار کے) لشکروں میں سے یہ ایک حقیر سا لشکر ہے جو اسی جگہ شکست خوردہ ہونے والا ہے''۔ (طاہر القادری)

''(جب میرا عذاب آجائے گا) تو اس وقت جماعتوں میں سے کوئی بڑے سے بڑا لشکر بھی شکست کھا کر رہے گا''۔ (امین احسن اصلاحی)

عام طور سے لوگوں نے اس آیت کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ اس میں مکہ کے مشرکین کا لشکر مراد ہے جس کے مستقبل میں شکست پانے کی خبر دی گئی ہے، اور بات مستقبل کی ہے لیکن تاکید کے لئے ماضی کا صیغہ اختیار کیا گیا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے ان تمام مترجمین سے ہٹ کر ترجمہ تجویز کیا ہے، وہ ترجمہ کرتے ہیں:

''جتھوں کے کتنے ہی لشکر ہیں جو شکست کھا چکے ہیں''۔

اس ترجمہ کے لحاظ سے لفظ (مَا) کثرت ظاہر کرنے کے لئے ہے، اور لفظ (هُنَالِكَ) ویسے ہی ہے جیسے انگریزی میں لفظ There آتا ہے، یعنی اس کا ترجمہ نہیں کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ انسانی تاریخ میں ایسی بہت ساری قوموں کی داستانیں محفوظ ہیں جنہوں نے رسول کی تکذیب کی اور ان سب کے لشکر شکست سے دوچار ہوئے، اس ترجمہ سے جہاں دوسرے اشکالات ختم ہوجاتے ہیں، وہیں سیاق کلام کا حق بھی بھرپور طریقے سے ادا ہوجاتا ہے، گویا اس آیت میں جو بات اجمال کے ساتھ کہی گئی اس

کی تفصیل اگلی تین آیتوں میں بیان کر دی گئی یعنی جن جتھوں کے لشکر شکست کھا چکے ہیں ان میں سے بعض کے نام بتا دیئے گئے۔ چاروں آیتوں کو ملا کر دیکھیں تو مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ۔ وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ۔ إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ۔ (ص:۱۱-۱۴) تیسری آیت کے اختتام پر (أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ) سے یہ بات متعین ہوگئی کہ احزاب سے مراد کون سے جتھے ہیں۔

(۵) ایک جیسے دو افعال کے درمیان تشبیہ کا ایک خاص اسلوب

قرآن مجید میں ایک اسلوب یہ ہے کہ ایک ایسا فعل جو لوگوں کی پریکٹس میں ہوتا ہے اور لوگ کر رہے ہوتے ہیں اور اس سے مانوس ہوتے ہیں، اسی کے حوالے سے اور اسی کی تشبیہ دیتے ہوئے لفظاً اسی جیسے فعل کے بارے میں بتایا جائے۔ یہ اسلوب قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے، مندرجہ ذیل دو مثالوں سے یہ اسلوب آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے؛

(۱) لَا تَجْعَلُوا دُعَاء الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاء بَعْضِكُم بَعْضاً۔(النور:۶۳)

''رسول کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرا لو جیسا تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے''۔(احمد رضا خان)

''مومنو پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو''۔(فتح محمد جالندھری)

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ۔(الحجرات:۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو''۔(سید مودودی)

ان دونوں مقامات پر مترجمین نے ایک ہی انداز کا ترجمہ کیا ہے اور درست کیا ہے ''جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو'' اور ''جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو'' کسی نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ ''جیسا تم کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانا چاہئے'' اور ''جس طرح تم کو آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرنا چاہئے''۔

تاہم یہی اسلوب جب کچھ اور آیتوں میں استعمال ہوا، تو وہاں ''کرتے ہو'' کی جگہ ''کرنا چاہئے'' کا بعض مترجموں نے ترجمہ کردیا، حالانکہ ان مقامات پر بھی موقعہ اور اسلوب دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتوں کی طرح ترجمہ کیا جائے۔

(۱) وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً۔ (الاسراء:۱۱)

''انسان شر اُس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہیے انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے''۔ (سید مودودی)

''اور انسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہئے''۔ (امین احسن اصلاحی)

مذکورہ بالا ترجموں سے بہتر اور اسلوب بالا کے مطابق مذکورہ ذیل ترجمہ ہے:

''اور آدمی برائی کی دعا کرتا ہے جیسے بھلائی مانگتا ہے اور آدمی بڑا جلد باز ہے''۔ (احمد رضا خان)

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے اور زیادہ مناسب پیرایہ اختیار کیا۔

''اور انسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جیسے وہ بھلائی کا طالب ہو''۔

انگریزی مترجمین میں مندرجہ ذیل ترجمہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

As it is, man [often] prays for things that are bad as if he were praying for something that is good. (Asad)

(۲) وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللّهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّهِ وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَشَدُّ حُبّاً لِّلّهِ۔ (البقرۃ:۱۶۵)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور اُن کے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں''۔ (سید مودودی)

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔'' (محمد جوناگڑھی)

یہاں بھی ''چاہئے'' والا ترجمہ درست نہیں ہے، کیونکہ اللہ سے جتنی محبت ہونی چاہئے اتنی تو کوئی کسی سے نہیں کرتا ہے، کیونکہ اللہ سے محبت کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ یہاں تو یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ مشرکین جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو بندگی میں شریک کرتے ہیں، اسی طرح محبت میں بھی شریک کرتے

ہیں، اور جس طرح اللہ سے محبت کا دم بھرتے ہیں، اسی طرح ان سے محبت کا بھی دم بھرتے ہیں۔ یہاں مفہوم اور اسلوب دونوں کا تقاضا ہے کہ مندرجہ ذیل ترجمہ کو درست مانا جائے:

''اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں کہ انہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں''۔ (احمد رضا خان)

(۳) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّواْ أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً۔ (النساء:۷۷)

''تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر''۔ (سید مودودی)

''تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو، اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوۃ دیتے رہو؟ تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے، یا اس سے زیادہ''۔ (امین احسن اصلاحی)

یہاں بھی ''چاہئے'' والا ترجمہ درست نہیں ہے، کیونکہ اللہ سے جتنی خشیت ہونی چاہئے اتنی تو کوئی کسی سے نہیں رکھتا ہے، اور یہاں تو (أَشَدَّ خَشْيَة) ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ سے جتنی خشیت ہونی چاہئے، اس سے زیادہ کسی اور سے خشیت ہو ہی نہیں سکتی۔ تدبر قرآن کی تلخیص کے ساتھ جو ترجمہ نظر ثانی کے بعد شائع ہوا ہے، اس میں ''جس طرح اللہ سے ڈرا جاتا ہے'' ترجمہ کیا گیا ہے، پیر محمد کرم شاہ ازہری نے بھی اسی طرح ترجمہ کیا ہے، لیکن یہ بھی اسی طرح نادرست ہے، جس طرح ''چاہئے'' والا ترجمہ درست نہیں ہے۔

ان ترجموں کے بالمقابل مندرجہ ذیل ترجمہ درست ہے:

''بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو (پہلے یہ) حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو (جنگ سے) روکے رہو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو بعض لوگ ان میں سے لوگوں سے یوں ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ''۔ (فتح محمد جالندھری)

صبا نے پھر درِ مطبخ پہ......

ڈاکٹر امتیاز وحید قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،
ای میل:ijnuwaheed@gmail.co موبائیل نمبر:07827925836

زندگی کی حرارت سے معمور کسی نظام کا تصور کبھی امکانی تغیر کے قدرتی عمل سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ تغیر کے عمل سے گزر کر ہر صبح بادِ صبا اپنی تازگی کے ساتھ نئی زندگی کی بشارت دیتی ہے۔ ’تبدیلی‘ پر مبنی ڈیکارڈ کا فلسفہ میرے مفروضے کی تائید کرتا ہے۔ مادرِ علمی جامعۃ الفلاح کے سیاق میں ڈیکارڈ کے فلسفے کی بات تو برسبیلِ تذکرہ آنکلی، گفتگو دراصل جامعۃ الفلاح کے نظام سے متعلق فلاح کے مطبخ اور اس کے امتیازات سے ہے، جسے نظامِ کہن سمجھ کر الوداع کہا جا چکا ہے۔ فلاح کے نظام کو زندگی بخش تبدیلیوں سے گزار کر اس میں بہتری کے جویا منتظمین نے ’’ٹفن سسٹم‘‘ کو اس کا بہتر نعم البدل جانا اور ۱۹۹۳ء سے اس کا نفاذ کر دیا۔ مجموعی نتائج کے اعتبار سے فلاح اپنے دوسرے معاصر اداروں میں اپنے اسی صحت مند رویے سے تناور ہو پایا ہے، جس کی خو فلاح کے قیام سے ہی وہاں کی خمیر میں شامل ہے۔ وقفے وقفے سے فلاح میں تجربی تغیر (Experimental Change) کا عمل مسلمانوں کی عمومی نفسیات سے بے میل ہے۔ ماضی پرستی مسلمانوں کی سائیکی کا حصہ ہے۔ ماضی پر افتخار ان کے یہاں لذتِ کار کی حرارت کا حصول نہیں بلکہ وہ سرمستی ہے جو انہیں تحرک کی بجائے تعطل اور جمود کا شکار بنا دیتی ہے اور اس آڑ میں بدخواہ ان پر بنیاد پرست، ضدی اور روشن خیالی سے گریزاں طبقے کا الزام عاید کر بیٹھتا ہے۔ خیر مدارس سے بہرہ ور تعلیم یافتہ سماج میں مطبخ اس نوع کی خالص گاڑھی باتوں کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔ ہمارے مدارس کے نظام سے وابستہ احباب خوب سمجھ رہے ہوں گے کہ مطبخ سے شکم سیرابی کے بعد گلفشانیِ گفتار کیا رنگ دکھاتی ہے۔ ہر چند کہ مطبخ کا دائرہ ’’رسوئی گھر‘‘ کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتا تاہم جامعۃ الفلاح میں لفظِ مطبخ کا قافیہ کبھی تنگ نہیں رہا بلکہ اس حد تک کشادہ ہے کہ اس کا مفہوم میس (Mess) اور طعام

گاہ(Dining Hall) کے وسیع کلچر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

۲۰۱۲ء میں جامعۃ الفلاح نے عمر کی پانچویں دہائی سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے جب ''لئن شکرتم لأ زید نّکم'' کی منزل پر اظہارِ تشکر کے لیے جشنِ طلائی کا اہتمام کیا تو جامعہ نے اپنے ان محسنین و معماروں کو یاد کیا، جن کے خونِ جگر سے مکتبِ اسلامیہ سے موجودہ جامعۃ الفلاح کے سفر کی حنابندی ہو پائی ہے اور پھر انھیں اپنی زرّیں 'تاریخ' کا حصہ بنالیا ہے۔ جامعہ کے منتظمین کے جذبۂ سپاس گزاری کو سلام اور تاریخ کی ترتیب و تدوین پر اس کے مرتب محترم ضیاء الدین بھائی کو ہدیۂ تہنیت۔ تاریخِ جامعہ کے مرتب کا اقبال ہے کہ ''یہ تاریخی دستاویز انتہائی قلیل مدت میں تیار کی گئی ہے'' (تاریخِ جامعۃ الفلاح، ص۔۱۵) لہٰذا اس کے تشنہ کام جہات سے پہلو تہی کرتے ہوئے بات صرف مطبخ کے ذکرِ خیر تک ہی محدود رکھی جائے گی۔ جامعہ کی تاریخ کے اوراق سے گزرتے ہوئے کئی بار جی میں آیا کہ مسکرادیں لیکن مسکراہٹ پر ضبط اور یادوں کا ہجوم غالب آتا گیا، تحیر اور تبسم سے پھر وہاں ملاقات ہوئی جہاں ضیاء بھائی نے صفحہ ۴۷/اور ۱۵۳/پر مطبخ کا ذکر 'کالملح فی الطعام' سمجھ کر کیا ہے۔ ضیاء الدین بھائی کو ان کے عہدِ شباب کا کوئی شناسا آج بھی دیکھ لے تو چونک پڑے گا، نبوت کی عمر سے گزر کر آج جب انھیں چکّی کی مشقت کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لکچرر شپ بھی مل چکی ہے تب بھی وہ ماشاء اللہ خاصے تومند نظر آتے ہیں۔ غالبًا یہ بات اب ان کے ذہن سے محو ہو چکی ہے کہ ان کی صحت کی نیو جامعۃ الفلاح ہی میں رکھی گئی تھی۔ البتہ فلاح کے نظام میں مطبخ کا کلیدی کردار منتظمینِ جامعہ کے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔ تاریخِ جامعۃ الفلاح کے سرِ ورق کی پہلی تصویر مطبخ کی ہے، جو مولانا مودودی ہاسٹل کی مرکزیت پر غالب نظر آتی ہے۔

دانش گاہیں مقدس ماؤں کی طرح تخلیقی عمل سے گزرتی ہیں۔ یہاں اساتذہ نسلِ نو کی نشو و نما میں ماہر کاشت کار کا فرض نبھاتے ہیں۔ کھیت کی فصل کے مانند طلبہ کو حار اور بارد موسم کی ستم ظریفی سے بچاتے ہوئے انھیں قدر آشنا کرتے ہیں۔ ان سب سرگرمیوں کا مدار صحت و تندرستی ہے اور اس کا منبع اچھی اور صحت مند غذائیں، جسے جامعۃ الفلاح کے تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے ترجیحی حیثیت حاصل رہی ہے۔ میں جس جامعۃ الفلاح کا پروردہ ہوں اس میں تعلیمی نظام کے متنوع پہلوؤں کا باقاعدہ قلم دان ہوا کرتا تھا۔ مطبخ ایک اہم وزارت تھی، جو فلاح کی مسجد میں جمعیۃ الطلبہ کے انتخاب کے ساتھ ہی تفویض کر دی جاتی تھی۔ میرِ مطبخ 'جنرل مانیٹر' کہلاتا تھا، جس کی مملکت میں شہنشاہِ اکبر سے بس ایک رتن کم ہوتا تھا۔ اس کی مملکت آٹھ ٹیموں پر مشتمل ہوتی تھی، جو باری باری مطبخ کے نظام کو چلاتی تھیں۔ کارزارِ حیات

کی گہما گہمی دیکھ کر علامہ اقبالؒ کے بہت سے رموز و علائم اور استعاروں کا مفہوم ہم پر وہیں واضح ہوا۔ آنکھوں کے اشاروں سے پیغام کی خاموش ترسیل ہو جاتی تھی کہ 'میرِ مطبخ موجود ہیں'۔ شروع میں ہم خاصے جری نکلے، غالباً ہم اس بلیغ جملے کی درست تعبیر سے ناواقف تھے۔ لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ ڈبلنگ میں خواہ کسی قدر مشاقی سے کام لیا جائے میرِ مطبخ کی تجربہ کار ''عقابی'' نگاہیں ضرور تاڑ لیں گی۔ مانیٹر شرعی طور پر بالغ عربی ششم سے کوئی پختہ کار متحرک شخص ہوا کرتا تھا۔ ٹیمیں اپنی جماعت کے افراد کے انتخاب کے لیے خود مجاز تھیں۔ ۱۲ر سے ۱۴ر طلبہ پر مشتمل یہ قافلہ مطبخ کے انتظام وانصرام پر دینی معتقدات کی طرح چاق و چوبند ہوا کرتا تھا۔ ٹیمیں اپنے حسنِ انتظام اور کردار کی گرمی سے پہچانی جاتی تھیں۔ اقبالؒ کی ''عقابی روح'' کو بیدار ہوتے ہم نے یہیں دیکھا۔

مطبخ کی کارگزاریاں صبح تڑکے شروع ہو جاتی تھیں۔ جفاکش باورچی صاحبان چولھے کے گرد پروانے کے مانند منڈلاتے نظر آتے تھے۔ گٹھیلے بدن والے قوی الجثہ 'رحمت' قوتِ بازو سے بڑے سینی میں آٹے اور پانی کو باہم متحد کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے جبکہ جناب علیم چاچا (بڑے میاں) اساتذہ کے کمروں تک کھانا پہنچاتے تھے۔ موسمِ سرما میں ان کے چہرے پر فتح مندی رقص کرتی تھی، حتیٰ کہ موسم کی حدت میں بھی انھیں دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ وہ کافی پُر جوش ہیں اور گرم مستطیل توے پر ''روٹی سینکنے'' کے محاورے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ہم نے ان کے حوصلے کبھی شکست خوردہ نہیں دیکھے۔ فرض کا احساس غالباً انسان کو اذیتوں سے بھی نباہ کا ہنر سکھا دیتا ہے۔ مطبخ میں تعینات ٹیم پر مشتمل طلبہ اور کھانا بنانے والے باورچی میزبان جبکہ بقیہ پوری طلبہ برادری مہمان ہوا کرتی تھی۔ یہ تھے نظامِ مطبخ کے کل پُرزے۔ میزبان ٹیم مطبخ میں قبل از وقت پہنچ کر میزوں پر صاف پلیٹیں سجاتی، دال اور چاول کے ڈونگے رکھتی تھی۔ خالی پلیٹ میں تلی ہوئی ہری مرچیں بطور تمہید رکھی جاتی تھیں۔ مطبخ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تاحدِّ نظر دونوں قطاروں میں میزیں بڑے سلیقے سے سجی نظر آتی تھیں۔ متوازی دونوں ٹیبلوں پر چار چار طلبہ آمنے سامنے بیٹھتے تھے۔ درمیان کی خالی جگہ گزرگاہ کے لیے مختص تھی۔ جس پر میزبان ٹیم کے ارکان اشیائے خورد ونوش سے لیس حاجت مندوں کے بس اشاروں کے منتظر نظر آتے تھے۔ ساری تیاری مکمل ہو جانے کے بعد گھنٹہ بجا کر مہمانوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اقامت گاہوں کے مکیں اپنے حجروں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر سوئے مطبخ روانہ ہوتے اور نہایت سرعت سے میزوں کی متعینہ نشستوں میں سماتے چلے جاتے تھے۔ نظم وضبط کا یہ عالم دیدنی ہوا کرتا تھا اور قابلِ رشک بھی۔ طعام گاہ میں طلبہ صرف اکل وشُرب کے مجاز تھے۔ غالباً اقبالؒ کا یہ مصرع ''یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں

میری'، مطبخ کے سکوت پرور ماحول میں ہماری بے تکلمی کی کیفیت کا درست نمائندہ تھا۔ باہم گفتگو ضابطہ شکنی تھی تو علامتی زبان عین ضابطہ داری۔ اس پرسکون فضا میں صرف چمچے تکلم کے مجاز تھے۔ ہماری سماعت سے صرف چمچوں کی آوازیں ٹکراتی تھیں۔ ہندوستان کے کاشت کاروں کی مرکزیت کے پیش نظر رَہَٹ کی آواز کو شہنائی سے تشبیہ دینے والے شاعر کی طرح مجھے بھی دال کے بھگونوں سے نبرد آزما چمچوں کی آواز میں جامعہ کے مطبخ کی ڈسپلن کی شہنائی سنائی دیتی ہے، جو آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے۔ جامعہ کو اپنے ضابطے کی صلابت پہ ہمیشہ بڑا ناز رہا۔ ہم نے بارہا اپنے اساتذہ کو اس عظیم الشان روایت کی لذت سے سرشار ہوتے دیکھا۔ استاذِ گرامی مولانا محمد عمران فلاحی صاحب کئی بار جامعہ کے بیرونی ہمدردگان اور بہی خواہان کے ساتھ مطبخ میں نظر آئے۔ طلبہ سے بھرے پُرے مطبخ کا نظم وضبط مینارِ فلاح کے مانند بلند کردار رکھتا تھا۔ ایسے موقعوں پر مولانا محمد عمران فلاحی صاحب کا سرخ چہرہ اور تمتما جاتا۔ پٹھانوں والی قد وقامت کا افتخار بس دیکھتے ہی بنتا تھا۔ ڈسپلن کے تناظر میں ان کی نظریں بار بار دادطلب نگاہوں سے باہر سے آنے والے زائرینِ جامعہ پر اٹھتی تھیں۔

مطبخ کا نظارہ کچھ یوں ہوتا تھا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کھائیں اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں من جانب اللہ اٹھا کر جس چیز کی کمی ہو اس کی بھرپائی کا سامان کریں۔ پرلطف نظارہ ہوا کرتا تھا۔ نظروں کے سامنے اوپر اٹھتی اور تکمیلِ حاجت پر غائب ہوتی انگلیاں۔ ہاتھ کی محض شہادت کی ایک انگلی پر روٹیاں، دو انگلیوں پر دال، تیسری انگلی پر نمک، چوتھے پر چاول اور پورا پنجہ (پانچ انگلیاں) قدرتی آب اور پلیٹ کی ضرورت کا استعارہ تھا۔ میزبان طلبہ کی آنکھیں اوپر کی جانب اٹھتی حاجت مند انگلیوں کی متلاشی رہتیں۔ اشارہ پاتے ہی میزبان ٹیم کے فعال ارکان لپکتے، ٹیم کے ننھے میزبان عموماً العطش کے ضرورت منداشاروں کی تکمیل پر مامور کیے جاتے تھے۔ ان کی روشن آنکھیں خدمت خلق کے جذبے سے سرشار نظر آتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچوں کے لیے طیبہ منزل کے دامن میں خود کفیل جونیر مطبخ کا نظم نہیں ہوا تھا۔ مطبخ کی ٹیم کے افراد میں عمر کا تفاوت تو یقیناً تھا لیکن ان میں کوئی محمود اور کوئی ایاز نہیں ہوا کرتا تھا سبھی محمود تھے۔ جذبے کی گرمی سبھوں میں یکساں تپشِ کار کا حکم رکھتی تھی۔ میرِ مطبخ اپنے اختیارات سے زیادہ اپنے فرائض کے تئیں چوکس رہتا تھا۔ غالباً اختیارات کی قوت کو فرائض کے تابع صرف اسلامی نظامِ عدل ہی میں رکھا جا سکتا ہے۔ غلام اور آقا کے درمیان یہ گراں مایہ نکتہ سیدنا حضرت عمرؓ کی سیرت کا نشانِ امتیاز ہے۔ نہیں تو شہدے اختیارات کی گرمی پاتے ہی کردار کی گرمی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مانیٹر کی کامیابی کا راز ٹیم کے حسنِ انتظام میں پوشیدہ تھا۔ اس کی فعالیت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میدانِ کارزار کا کوئی

مشاق جرنل ہے، جس کی نگاہیں دو متوازی میزوں پر ماموراپنے میمنہ اور میسرہ کی کارگزاریوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ وہ بڑی سرعت سے کمزور محاذ پر کمک بھیجتا ہے اور سنگین صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود کو پیش کرنے سے بھی گریزاں نہیں ہوتا۔ وہ کبھی ٹیم کے ممبر کو ٹیبل پر ماںقی اشیاء کو محفوظ کرنے کی ہدایت دیتا ہے، کبھی پڑوس کے ٹیبل پر موجود اشیائے خورد ونوش کی اضافی مقدار سے حاجت روائی کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ سامانِ رسد (اسٹاک) پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے۔ اس کا ذہن کسی بھی متوقع یا غیر متوقع صورت حال سے نپٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ میزبان ٹیم کے اعمال نامے میں تحرک اور فعالیت کی کئی پاکیزہ کیفیتوں کو جملوں میں نقل کرنے اور انھیں آج کی 'ٹفن بردار' نسلِ نو میں تقسیم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے عہد کی اس رودادِ عزیمت کا مبدأ ومنتہا قرآن کی یہ پاک آیت تھی—''انَّ اکرمکم عندالله اتقاکم''۔ اس موقعے سے میں جناب مشتاق احمد فلاحی (لبستی) (۱۹۸۶)، جناب امیر الحسن فلاحی (بدایوں) (۱۹۸۷)، جناب احسان اللہ فہد فلاحی (۱۹۸۸)، جناب مشیر حسین فلاحی (سنبھل) (۱۹۸۹) اور جناب محمد جمال فلاحی (سنبھل) (۱۹۹۰) صاحبان کے ذکرِ خیر سے اپنی اس بے فیض رپورٹ کو مُطَہَّر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرے قیام جامعہ ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء یہ ہمارے مطبخ کے جرنل مانیٹر تھے۔

ستر (۱۹۷۰) کی دہائی میں ریاست اڑیسہ میں زبردست قحط پڑا تو حاملین مطبخ کا ایک اجماعی کردار بھی سامنے آیا، جسے سنہرے حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ فلاح کے طلبہ نے اس قدرتی آفت سے نپٹنے کی اپنے طور پر ایک راہ نکالی۔ تمام طلبہ نے تین دن تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا اور اس سے جو رقم بنتی تھی، اسے اڑیسہ ریلیف فنڈ میں بھجوایا۔ حسنِ کردار کا ایسا تاریخ ساز نظارہ ہمارے نظامِ مطبخ کی شناخت ہے۔

جامعہ کے نظام سے متعلق یہ تحریر کرتے ہوئے سربلندی اور سرشاری کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے کہ وہاں اساتذہ اور طلبہ دونوں طبقوں کے لیے ایک ہی نوعیت کے کھانے کا اہتمام تھا۔ کبھی کبھار ہمارے اساتذہ ہمارے ساتھ مطبخ میں بیٹھ کر بھی کھانا کھالیا کرتے تھے۔ اے کاش کہ ہندوستان کے دیگر مدارس میں بھی ایسا ہوتا۔ مرحوم مربی استاذِ گرامی قدر مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب کبھی مطبخ میں معاً ہمارے درمیان وارد ہوجاتے اور اپنے مخصوص طربیہ انداز میں کسی کے پلیٹ سے روٹی کا کوئی ٹکڑا توڑ لیتے یا ٹیبل پر پڑا روٹی کا کوئی ٹکڑا اٹھا کر کسی کے سالن کے ساتھ کھالیتے تھے۔ اس وقت نہ نظر تھی نہ ہی احساس کی دولت، جس سے ہم یہ جان پاتے کہ جان بوجھ کر روٹی کا کوئی پڑا ٹکڑا کھا کر وہ ہمیں کس چیز کا درس دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ جرنل ضیاء الحقؒ کی شہادت کی المناک خبروں کے بیچ، ان کی سیرت کی

جو چند تصویریں سامنے آئیں تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ مرد خدا بھی اسی قلندرانہ شان سے متصف تھا، جس کی جھلک مطبخ میں ہمارے اساتذہ پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔

ملک کے دیگر مدارس کی طرح فلاح کا نظام بھی اہلِ خیر کی نیک نیتی سے ہی گردش کر رہا ہے۔ تاہم فلاح کا وظیفہ سسٹم دیگر معاصر مدارس کے نظام سے یکسر مختلف ہے۔ اوّلاً یہاں خود کفیل طلبہ کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ جامعۃ الفلاح ایک زندہ اور زندگی سے بھرپور تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ادارہ ہے۔ ملک کے مدارس میں یہ ادارہ ذی ہوش متمول گارجین کی پہلی پسند ہے۔ یہاں طلبہ کا دوسرا ضرورت مند طبقہ محض اس بنیاد پر وظیفہ یاب نہیں ہوسکتا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ وظیفہ کے لیے یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے لیکن اس سے اوپر اٹھ کر فلاح نے وظیفہ کو ایوارڈ اور تشجیعی قدر کا حامل بنا رکھا ہے۔ اس کی حصولیابی کا انحصار بڑی حد تک طلبہ کی عمدہ کارکردگی پر ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں فرسٹ ڈویژن اس کا پیمانہ تھا۔ طلبہ پر وظیفہ سلبی کی تلوار ہمیشہ معلق رہتی تھی۔ ناقص نتائج کسی میقات میں پریشان کن ہو سکتے تھے۔ دیگر فرائض اور تحدیدات اس پر مستزاد تھیں۔

طلبہ کی 'عزت نفس' کا پاس جامعۃ الفلاح کے وظیفہ امور کا زیور ہے۔ فلاح سے پانچ یا سات سالہ عالمیت اور فضیلت کا کورس مکمل کرنے کے بعد بھی کانوں کان کسی کو اس بات کی بھنک نہیں لگ پاتی تھی کہ کون طالب علم وظیفہ یافتہ ہے اور کون خود کفیل۔ دونوں میں عزتِ نفس کی روح یکساں طور پر بیدار نظر آتی تھی، جس کا اظہار طلبہ میں خود اعتمادی کی صورت میں عیاں ہوتا تھا۔ اس طرح یہاں کا ہر لاہوتی طائر پرواز کا خوگر ہوا کرتا تھا۔ ہمارے جامعہ کا یہ روشن پہلو مدارسِ اسلامیہ کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

میزبان اور مہمان کے ساتھ مطبخ کی تثلیث کا تیسرا محور عالی مقام مرحوم ماسٹر جنید صاحب (غازی پوری) تھے، جو انتظامی سطح پر مطبخ کے انچارج تھے، ان کا قیام مطبخ کے احاطے ہی میں تھا۔ انتظامی امور کی چھوٹی سی عمارت کی پہلی منزل مطبخ کا دفتر ہوا کرتی تھی۔ جامعہ میں 'نگراں' کے بطور اپنے پہلے تقرر سے وہ ''نگراں صاحب'' کہلائے اور اسی نام سے مقبول بھی ہوئے۔ بعض دفعہ ان کی فربہ جسامت اور اس سے بے میل ان کی باریک منحنی آواز بھی ان کا شناخت نامہ تھی۔ جامعہ کے سارے منی آڈر انہی کے پاس آتے تھے، وہ کئی بچوں کے گارجین اور ان کے امین بھی تھے۔ عصر کے بعد عموماً وہ بچوں کے مطالبات کے بیچ گھرے نظر آتے تھے۔ بچوں سے انھیں چاچا نہرو والی انسیت تھی۔ شرارتاً انہی کے آس پاس بچے ان سے نظریں بچا کر ان کی مخصوص آواز میں زور سے ''منصور'' (غالباً مطبخ کے منیجر تھے) کی آواز لگا بیٹھتے لیکن ان کی طبیعت کبھی گراں بار نہیں ہوتی تھی۔ وہ جامعہ کی فوڈ منسٹری کے سالارِ اعظم تھے۔ ان کے

حساب و کتاب پر کسی نے کبھی انگشت نمائی کی جرأت نہیں کی بلکہ عالم یہ تھا کہ بلریا گنج ڈاک خانے کا ادھیکاری بھی بسا اوقات بہی کھاتوں میں اصلاح کے لیے ہمارے مطبخ کے میر کارواں سے رجوع کیا کرتا تھا۔ جامعہ کے وظیفہ نظام میں اخفاء اور وزارتِ تغذیہ کے پائی پائی کا حساب ان کا جز و ایمان تھا۔

ناشتے میں تلے ہوئے چنے کی روایت مطبخ میں نقشِ کہن کا درجہ رکھتی تھی، جس کے بغیر سارے نقش ادھورے تھے۔ فلاح میں ناشتے کا چنا تغیراتِ دہر سے ماوراء کوئی حقیقت ہے۔ وہی لذت، وہی رنگت اور وہی مقدار۔ اے ایم یو کے میس سے منسوب ایک روایت ہے کہ یونیورسٹی میں غیر معمولی تغیر سے حیران و پریشان سرسیدؒ کی روح کو میس کی 'دو روٹی دو بوٹی' دیکھ کر ہی اپنے قائم کردہ کالج کا یقین آیا۔ جامعہ کے مطبخ میں چنا وہی ''بنیانٌ مرصوص'' ہے۔ اس میں اسپ تازی کی چستی اور نظامِ ہاضمہ کی درستگی کا راز پنہاں ہے۔ اس کے باوجود اس میں طلبہ کے دامن دل کو کھینچنے کی صلاحیت کم ہی پائی جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے فارغ محترم خالد سیف اللہ فلاحی صاحب کی اطلاع کے مطابق ''اس وقت ہم لوگوں کو جو ناشتہ یا کھانا ملتا تھا وہ جیل کے کھانوں سے مشابہ تھا۔ بس ہم لوگ اس کو گھی اور اچار کی مدد سے مزیدار بنانے کی کوشش کرتے تھے'' (حیاتِ نو اکتوبر۔دسمبر ص۔۱۱)۔ لیکن ۱۹۸۶ میں جب ہم فلاح میں داخل ہوئے تو وہاں کے کھانوں پر نکھار آ چکا تھا۔ ہر چند کہ چنے کے باب میں شکیبائی لازم تھی تاہم جیل کے کھانوں سے تشبیہ دے کر ہم روزِ قیامت اپنا دامن چنے کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ وہ ظہرانے اور عشائیہ کی طرح قد آور نہیں تھا۔ چنے کی اسی بے کیفی سے فائدہ اٹھا کر سفیان کی پوری اور للّن کی پوری، دہی آمیز سبزی اور گرم جلیبیوں کو فلاح میں دراندازی کا موقع ہاتھ آیا۔ ناشتے کے لیے جوق در جوق قافلے کو بیرونی نقص تغذیہ سے دور رکھنے کی آڑ میں مطبخ کے سامنے چھپر اور بانس بلی پر مشتمل ایک کیفے نے ہمارے ناشتہ سسٹم کو للکارا۔ لیکن چنا تو بالآخر 'بنیانٌ مرصوص' تھا سو اس کی مرکزیت کو کسی طور بھی چیلنج نہیں کیا جا سکا۔ رفتہ رفتہ طلبہ نے چنے میں کیف وطرب کی ایک صورت نکالی اور رات کی بچی کھچی باسی روٹی کو گرم کر کے دونوں کے امتزاج سے ایک مزیدار recipe بنائی، جس سے چنے کی ساکھ کو از سر نو بحال کرنے میں کافی مدد ملی۔ اس تشویق نے ناشتے کے صیغے میں مطبخ کو پسپائی سے دور رکھا۔ باسی روٹی کا فیض عام نہیں تھا، اس لیے اس کے حصول میں اہل دل قسمت اور تدبیر دونوں کو بروئے کار لاتے تھے۔ جسے اس کی دولت ہاتھ آتی وہ خوش بخت اور بقیہ تہی بختوں کے لیے وہ قابلِ رشک ٹھہرتے تھے۔ ایک پلیٹ چنے میں دو طالب علم مشترکہ طور پر ناشتہ کیا کرتے تھے۔ یہ روایت بھی بے فیض نہیں تھی۔

جامعۃ الفلاح میں ناشتے کی متبادل صورتوں میں بند یا پاؤروٹی بھی کثیر الاستعمال تھی۔مثالی بورڈنگ کی دیوار سے متصل قبرستان کی جانب سے ہرصبح ایک نحیف بزرگ بنداور پاؤروٹیوں سے لدی اپنی سائیکل کے ساتھ''پاؤروٹی لےلو،گرماگرم'' کی آواز لگاتا۔فجر کی نماز کے بعدعموماً طلبہ میں اس کا انتظار رہتا تھا۔کثرت استعمال کے سبب اس کی آواز بسااوقات لڑکھڑا کے بیٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔اس کے باوجودبچوں کے لیےاس میں''بڑے رسیلے پھالسے'' والی جھنکارموجودتھی۔پہلی منزل سے ہم رسیوں کی مدد سے پیسہ اورکوئی پالی تھین نیچے ڈالتے اورگرم پاؤروٹیوں سےلطف اٹھاتے تھے۔

صبح میں بلاناغہ ایک بوڑھا اہیر بھی جامعہ میں اپنے دودھ کے ساتھ دکھائی دیتا تھا۔مشہورتھا کہ اس کا دودھ'اخلاص' کی دولت سے محروم ہے۔پانی سے اس کے دودھ کو بڑی الفت تھی۔پانی سے اس کے دودھ کاتعلق مادرِوطن ہندوستان سے کشمیر کے رشتے کی طرح دوجان ایک قالب کا تھا،جس میں بوڑھے گوالے کی قسمیہ یقین دہانیوں کے باوجود جبر کا پہلو غالب تھا۔ ہر چند کہ دودھ میں محلول پانی بھی ہمیں ہمیشہ دودھ ہی نظرآیا۔لیکن اہلِ نظر نے انھیں ہمیشہ دوخود مکتفی جداگانہ اکائی کی حیثیت ہی سے دیکھا۔ مملکتِ کلاہ جامعۃ الفلاح کے شرعی وضع قطع والے ماحول میں دودھ والے بوڑھے کی گاندھیائی طرزِ لنگوٹ بھی توجہ طلب تھی،جس میں خالص ہندوستانیت باس کرتی تھی۔تاہم اپنے پیشے میں وہ مشرق کے دھرم سے زیادہ مغربی اَدھرمی کا قائل تھا۔سینئر طلبہ تھرمامیٹر کی طرح کسی مستطیل چیز سے گاہے بگاہے اس کے دودھ کےاخلاص کی پیمائش کیا کرتے تھے۔یہ غالباًاسے حدِاعتدال میں رکھنے کی ترکیب تھی۔

۱۹۸۶ء کےاوائل اوراس کے کچھ دنوں بعدتک ظہرانے (Lunch) میں تلی ہوئی مرچ کےساتھ سبزیاں بھی پروس دی جاتی تھیں،بعد میں سبزیاں حتی کہ گوشت سے بھرے ڈونگے بھی میزوں پر کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے نظرآنے لگے۔ڈبلنگ کا ساتھ بس یہیں تک رہا۔نہیں تو ایک پلیٹ کے چنے دوسری پلیٹ کے چنے کےساتھ اورایک پلیٹ کی سبزی دوسری پلیٹ کی سبزی کےساتھ باہم شیروشکر ہوکرڈبلنگ کےآفاقی تصورکواجاگرکرتی تھیں۔ڈبلنگ کا جوت جگانے والے جادوگر ہرجگہ اور ہرلمحہ پائے جاسکتے تھے۔وہ اتنے مشاق ہوا کرتے تھے کہ بسااوقات اس کی عقابی نظر مانیٹر کی پارکھ نگاہوں کوبھی جُل دے جاتی تھی۔اس کی عملی تعبیر بس آنکھوں کےاشارے میں پوشیدہ رہتی تھی۔یہ ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' جیسا کوئی غیرمحسوس عمل معلوم ہوتا تھا۔

فلاح کی دال مطبخ میں میز پر چنے ہوئے کھانوں کے بیچ دلبر کا مقام رکھتی تھی۔اس کی اوپری سطح پر مرغّن پیاز کی بریانی کی ایک دبیزتہہ جمی ہوتی تھی۔دال سے بھرے ڈونگے کی نچلی اور بالائی سطح طلبہ کی

پہلی پسند تھی۔اس کے دونوں حصوں کی یکجائی پلیٹ میں دلربائی کی کیفیت پیدا کردیتی تھی،جس کی موجودگی سبزی سے بے نیازی کا باعث بھی ہوا کرتی تھی۔اعظم گڑھ کے قرب و جوار میں اکثر و بیشتر فلاح کی 'دَلیا' کا ذکرِ خیر سنا گیا۔بعد میں اس کا دائرہ بڑھتا گیا۔ملک کے جس خطے میں اس کے فیض یافتہ گئے،وہاں وہاں فلاح کی دال کی خوشبو پھیلتی چلی گئی۔یہ خوشبو فلاح کے صیغۂ تغذیہ کا سفیر ہے،جس سے وہاں کے نظام میں اچھی غذا،صحت مند ذہن اور صاف ستھرے ماحول کا اشارہ پوشیدہ ہے۔

ہندوستانی مدارس کے باب میں ایسی دل آویز تصویریں کمیاب ہیں۔ہم نے بچپن میں اپنے بڑے بھائیوں کو اپنے مدرسے کے تعلق سے ہمیشہ شاکی ہی پایا۔مدرسے کا ذکر سنتے ہی ان کی زباں پر یہ مصرع رقص کرجاتا تھا۔ع

بھات گیلا،دال پانی،بے نمک کی بھاجیاں

ماہنامہ 'الہدیٰ' (دربھنگہ) کے ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء کے کسی شمارے میں تو یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ایک طالب علم نے 'دارالفتاویٰ' کے کالم میں علمائے دین شرح متین سے یہ جاننے کہ کوشش کی کہ کیا مدرسے کی دال کے پانی سے وضو جائز ہے؟۔اس وقت اس کالم کے روح رواں مولانا عبدالرحمٰن سلفی صاحب ہوا کرتے تھے۔اس حقیقت کے برعکس فلاح کے مطبخ کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ شکر اور سپاس گزاری کے جذبے کو مہمیز لگاتی ہیں۔

مطبخ کی حیاتِ مستعار کا بیش قیمتی لمحہ ''دِی ڈے'' کہلاتا تھا۔یہ اسم بامسمّیٰ تھا۔فلاح میں اس کا مقام پری نگر کی کسی لذیذ دعوت جیسا سحر انگیز تھا۔عربی گرامر کا سہارا لیا جائے تو مطبخ کے عام ایام کو ''نکرہ'' اور دِی ڈے کو ''معرفہ'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔'الیوم' کے بجائے انگریزی کے لفظ 'DAY' اور وہ بھی حرفِ تخصیص 'THE' کے اہتمام کے ساتھ اس مبارک لمحے کا جامع تعارف تھا۔اس کے فضائل پر آج بھی فیض یافتہ فلاحی برادران رطب اللسان ہوجاتے ہیں۔اس خوشگوار لمحے کی میزبانی خوش بخت ٹیم کا مقدر ہوا کرتی تھی۔اس کے انتظار کی ساعتوں اور نمازِ مغرب کے بعد طعام گاہ میں داخلے تک طلبہ میں کرب و ابتلا کی درست تصویر کشی کے لیے ایک دفتر مطلوب ہے۔یہ بھی عجب بات ہے کہ نام کے مفہوم کے برعکس اس کی بزم غروبِ آفتاب کے بعد رات کی سرحد سے پہلے شام کے دامن میں آراستہ ہوتی تھی۔یہ سارے تضادات اس کی شدّت اور اہمیت کے تناظر میں بامعنی تھے۔

سیدالایام کے موقع سے نان یا شیر مال،گوشت،پلاؤ اور زردہ مطبخ کی زینت میں اضافے کا باعث تھے۔ہم بوڈر طلبہ اپنے غیر بوڈر دوستوں کو بڑے اہتمام سے دعوت دے کر اس خوشگوار ساعت

سے ایک ساتھ لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔اس موقع سے حفاظتی عملے میں شامل ہمارے اساتذہ اور نگراں حضرات کی محافظ نگاہوں میں ''آپ سی سی کیمرے کی نگرانی میں ہیں'' جیسا واضح پیغام دکھائی دیتا تھا۔ بدنظمی کا گزر کیونکر ممکن تھا۔اس کے باوجود بڑے خشوع وخضوع سے شیر مال پر ہاتھ صاف کئے جاتے تھے۔طلبہ اسے ڈبلنگ کی شریعت کا احیاء تصور کرتے تھے۔یادش بخیر! ہمارے پاس اب صرف یادوں کا قافلہ ہے۔

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

فلاح کے اس متمول نظام کے پروردہ طلبہ کی عمدہ صحت یقینی بات تھی۔ ہمارے عہد کا فلاح اس امتیازی تفوق کا حامل تھا۔طلبہ کی عمدہ صحت سے مطبخ کے حسنِ انتظام کی شعائیں پھوٹتی تھیں۔اسی کے فیض سے محترم بھائی عبدالرشید اعظمی فلاحی ''رشید پہلوان'' کے نام نامی سے مشہور ہوئے۔اس ضمن میں افسر فلاحی (بلریا گنج)، خورشید فریہا، معاذ اکرم، عامر اصغر، رئیس کامل، جاوید بیگ (حیدرآباد)، زبیر نلا، محمد افضل صدیقی اور ارشد صدیقی جیسے بے شمار احباب قابلِ ذکر ہیں۔ بھائی عمران سنجر پوری اور شبیر گیاوی کی قوتِ بازو کے چرچے تھے۔افسر بھائی نے اسی صحت مندی کو بنیاد بنا کر جامعہ کی مسجد میں در آنے والے ایک بانکے سانڈ سے لوہا لے لیا اور بڑی جرأت مندی دکھائی۔وہ الگ بات ہے کہ مدِّ مقابل کی تاب نہ لاکر انھوں نے حوض میں چھلانگ لگا کر جان کی امان پائی۔یہ ادا اور حوصلہ بھی اسی صحت مند نظامِ مطبخ کی دین تھا۔اگر اس باب میں ہم سے آج بھی کوئی ہمارے عہد کے دو نمائندگان کا نام معلوم کرے تو مقامی طلبہ کی جانب سے بھائی 'رشید پہلوان' اور بیرونی طلبہ کی نمائندگی کے لیے محترم بھائی احسن فلاحی صاحب کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

بشری تقاضوں کے تحت ہم نے بسا اوقات مطبخ کا حسن زائل ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔دورانِ طعام کسی چیز کی کمی سے بدمزگی کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں۔کبھی کبھی آپسی نوک جھونک، سازش، حریفانہ چشمک، صف آرائی اور تو کبھی کبھار اس سے آگے بڑھ کر گلہ بندی کی شدت بھی اپنا رنگ دکھاجاتی تھی۔ایک دفعہ تو ہم نے چمچے کو اپنی نغمگی سے بیزار ہوا میں اڑتے دیکھا۔معاً ایک سینئر نے ہمارے استعجاب کا شرعی جواز پیش کرتے ہوئے ہم پر 'حق و باطل کی کشمکش' کا دفتر یوں کھولا کہ ہم حیرت کی منزل سے بہ آسانی نکل آئے۔ایسے موقعوں سے اقبالؒ کی شاعری میں ''لہو گرم رکھنے'' کا کنایہ طشت از بام ہو جاتا تھا۔یہ کسی نظام میں صحت مندی کی دلیل ہے اور خفگی کے اظہار کا جمہوری طریقہ بھی، جس کے

بغیر متحرک سسٹم کا تصور عنقا ہے۔

مطبخ کے حاملین چونکہ نئی نسل کے نو جوان تھے اس لیے کھانے کی مقدار اور ان کے مضبوط معدے کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ حریفانہ چشمک اور صف آرائی کی بساط احباب دوسروں کی باری میں زیادہ کھا کر یا کسی ایک چیز پر زور ڈال کر بھی بچھا سکتے تھے۔ جو کبھی روٹی، کبھی چاول تو کسی اور چیز کے بحران کی شکل میں نمو پذیر ہوتا تھا۔ ہم نے پانچ یا سات سال میں جتنا کھانا وہاں کھایا اتنی مقدار اب یقینِ کامل ہے کہ باقی ماندہ زندگی میں نہیں کھایا جا سکے گا۔ اس نوعیت کے بحران کا علم بھی ہمارے باصفا مانیٹر کو ہوا کرتا تھا، جس پر قابو پانا اس کی لیاقت میں شامل تھا اور وہ اس سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔

اپنے دورانِ قیام ہم نے مطبخ کو مذبح کے طور پر بھی مستعمل دیکھا نل کے پاس ہی بسم اللہ اللہ اکبر کی روایت ہفتے میں دو دن دہرائی جاتی تھی۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر تو مطبخ قصاب خانے کا منظر پیش کرتا تھا۔ تعطیل میں جو طلبہ جامعہ میں قیام کرتے ان کے طعام کا پورا نظم مطبخ میں ہوا کرتا تھا۔ ایسے موقعے سے کھانا بنانے اور مطبخ کی دیگر سرگرمیوں میں طلبہ بھی ہاتھ بٹاتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس نوع کی عملی تربیت زندگی میں کبھی بھی سودمند ہو سکتی ہے۔ میرے مربی استاذ مولانا محمد اسمٰعیل فلاحی نے بتایا کہ ان کے طالب علمی کے زمانے میں کسی بات پر خفگی کے اظہار کا جمہوری طریقہ اپناتے ہوئے فلاح کے باورچیوں نے ہڑتال کر دی۔ اس وقت طلبہ نے مطبخ کی تربیت سے فائدہ اٹھایا اور مورچہ سنبھال لیا۔ البتہ ہمارے زمانے میں باورچیوں کی جانب سے ایسا کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ بھی فلاح کے نظامِ مطبخ کی خوبی کہیے کہ اس کا ایک ایک پہلو روشن اور کامیاب کہا جا سکتا ہے۔

مطبخ کے باب الداخلے پر لوہے کا ایک میانہ قد دروازہ تھا، دائیں ہاتھ پر نگراں صاحب کا انتظامی دفتر اور بائیں طرف طعام گاہ۔ نیم کے پیڑ پر ناپ تول کے لیے ترازو معلق رہتا تھا۔ اسی کے پائنتی میں پانی کا نل اور اس کا چبوترہ تھا، جس کے دائیں جانب مصغّر طعام گاہ، جو عموماً سینئر طلبہ کے لیے مختص تصور کی جاتی تھی۔ اس سے متصل نل کے سامنے والے حصے بھی جونیئر طلبہ کے لیے میزوں سے آراستہ ہوتے تھے۔ وہیں سے ایک گزرگاہ باورچیوں کی کرم بھومی کی طرف نکلتی تھی، یہ مطبخ کا آخری حصہ تھا، جس کے ایک کونے میں کوئلوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ یہ تھا مطبخ کا طبعی جغرافیہ، جو اندرونِ مطبخ کی صورت گری پر مشتمل تھا۔

مطبخ کے احاطے سے باہر، اس کے مثالی ڈسپلن سے بے نیاز مطبخ کے عقبی حصے میں، کونے کی ایک خالی جگہ پر بدنظمی اور انارکی کا میلہ لگتا تھا۔ اس کے منتظم بلریا گنج کے مقامی سکان ہوا کرتے تھے۔ فارغ

الدہن ہڈیوں پر کتے ایسے ٹوٹتے تھے جیسے آج قومیں مسلمانوں پر ٹوٹی پڑتی ہیں۔ برابر ہی ایندھن کی لکڑیوں کا بڑا ٹال تھا۔ معاذ اللہ! ایسے موقعوں پر ان لکڑیوں کی ہمارے قوتِ بازو سے کم کم ہی سہی لیکن دیرینہ نسبت رہی ہے۔ کتوں کی بلند آوازیں یوں تو پتھر کی مدد سے بھی سنی جا سکتی تھیں مگر شرارت پسند بچے اس امر میں لکڑیوں کے انبار سے فیض اٹھانے کو ترجیح دیتے تھے، جن پر عموماً ہماری سرزنش بھی ہو جایا کرتی تھی۔

مثل مشہور ہے کہ 'دانے دانے پر لکھا ہوتا ہے کھانے والے کا نام' مطبخ میں جن کھانوں پر ہمارا نام نہیں لکھا ہوتا تھا، ان پر نگراں صاحب کے رجسٹر میں بلریا گنج کے چوپایوں کا نام لکھ جاتا تھا۔ بچے کھچے کھانوں کو ایک جگہ محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ بعد میں وہی باقیات ٹین کے بڑے کنستروں میں بھر کر گاؤں والے اپنے مویشیوں کے لیے لے جاتے تھے۔ اسے بھی جامعہ کے نظامِ طعام کی ایک خصوصیت شمار کی جانی چاہیے۔

مطبخ کی ابتدائی تاریخ سے متعلق استاذِ گرامی قدر مولانا محمد عمران فلاحی صاحب کی فراہم کردہ اطلاع کے بموجب ابتدا میں موجودہ فلاح جب مکتب اسلامیہ سے 'جامعہ اسلامیہ' بنا، اس وقت وہاں مقامی طلبہ ہی تعلیم پاتے تھے، جنھیں طعام و قیام کی ضرورت نہیں تھی۔ مولانا شبیر صاحبؒ پہلی بار بیرونی (پورنیہ ضلع، صوبہ بہار) طلبہ کے ساتھ فلاح میں آئے، تو ان کے کھانے کا نظم چند مخیّر حضرات کے گھر کیا گیا۔ منظور احمد جناب الحاج ابوالاعلیٰ مرحوم کے گھر، محمد عیسیٰ جناب امانت اللہ صاحب مرحوم کے گھر، محمد ذکی منشی فوجدار صاحب اور مسعود احمد جناب بابو مطیع الرحمٰن صاحب مرحوم کے گھر کھانا کھایا کرتے تھے۔ طلبہ کی تعداد میں اضافے کے ساتھ اوّلاً ایک باورچی کا نظم کیا گیا، جو بلریا گنج سے متصل محمد پور کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام جواہر تھا۔ اسے بچوں سے ماں باپ والی الفت تھی۔ یہ ابتدائی نظم کچھ دنوں تک جناب ماسٹر جنید احمد مرحوم کے بازار میں سڑک کے کنارے والے کھپریل کے مکان پر رہا، اب اس کے مرحوم وجود پر 'ذائقہ کارنر' نام کا ایک سادہ سا ہوٹل چل رہا ہے۔ پھر یہ مطبخ مدرسہ کیمپس کے اندر مودودی ہاسٹل کے دکھن جانب منتقل ہو گیا۔ بچے تینوں وقتوں میں، ناشتہ اور کھانا مودودی ہال کے دکھن جانب والے برآمدے میں ٹاٹ بچھا کر کھاتے تھے۔ اس کے بعد ایک خود مکتفی مطبخ اور اس کے مکمل نظام کے لیے ایک الگ حصّہ مختص کیا گیا، جو موجودہ کینٹین اور بس اسٹینڈ کی جگہ تھا۔ اسی سے متصل اس کا آفس اور غلّے کا گودام بھی بنایا گیا، جو اب بھی کینٹین کے اتر جانب دو منزلہ چھت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں پر بھی طلبہ شروع میں ٹاٹ بچھا کر ہی کھانا کھاتے تھے۔

مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کی نظامت میں جب منشی انور صاحب نائب ناظم ہوئے تو ٹاٹ کی جگہ میز اور بنچ نے لے لی۔ یہ انجمن طلبہ قدیم کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ قدیم طلبہ نے ہی فنڈ کی فراہم کی۔ ایک قدیم فلاحی کے بقول خود منشی انور صاحب نے ڈھائی ہزار روپے کی خطیر رقم اس مد میں صرف کی اور اپنی نگرانی میں ڈائنگ ٹیبل بنوائی۔ اس طرح ہمارے مطبخ کا مزاج، ہندستانی مدارس کے عمومی مزاج سے قدرے نفیس ہوگیا۔

مطبخ میں مستعمل علامتی اشاروں کے مأخذ سے متعلق قرین قیاس یہ تھا کہ یہ اشارے مہاجر ہیں، جو تحریکی مزاج رکھنے والے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) سے ہجرت کرکے فلاح آنے والے ہمارے بعض اساتذہ کے ہمراہ فلاح کے مطبخ میں داخل ہوگئے ہوں گے اور اصلاح کی قدامت کے پیشِ نظر یہیں سے اس خام خیالی کو بھی راہ ملی کہ ان مخصوص اشاروں کو جماعتِ اسلامی کی درسگاہِ اسلامی رام پور میں مدرسۃ الاصلاح سے درآمد کیا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ کافی چھان بین اور استفسارات کے بعد اس نتیجے تک رسائی ہوئی کہ مطبخ میں مستعمل اشارے ہمارے نظامِ مطبخ کے زائدہ ہیں۔ اجتماعی طعام میں شور وشرابے اور ضابطہ شکنی کے پیش نظر یہ اشارے وضع کئے گئے تھے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر غالب امکان ہے کہ انھیں دیگر اداروں نے بھی ہمارے نظام سے اپنایا ہو۔ ابتداءً جب طلبہ اجتماعی کھانے کے آداب سے ناواقف تھے تو یہ علامتی زبان کا طریقہ اپنایا گیا۔ نہیں تو اس سے قبل نظم وضبط کو یقینی بنانے کے لیے ہر وقت کسی نہ کسی نگراں کی موجودگی ناگزیر تصور کی جاتی تھی۔

ذیل کے شعر میں 'فیض' کی جگہ 'مطبخ' کی تحریف کے لیے ہم افتخار عارف سے معذرت خواہ ہیں۔ افتخار عارف کے شعر میں ترقی پسند شاعر 'فیض' سے شرف استفادہ کا نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ مطبخ سے کسبِ فیض کے سیاق میں یہی شعر وہاں کے فیض یافتگان کے احساس کا نمائندہ ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

جو مطبخ سے شرفِ استفادہ رکھتے تھے
دلوں کو صورتِ معنی کشادہ رکھتے تھے

اپنی آپ بیتی ''آشفتہ بیانی میری'' میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اے ایم یو کے میس کے تعلق سے بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہے۔ لکھا ہے کہ ''یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی وہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدا بہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو''۔ انھوں نے صاحب باغ میں مقیم سینئر طلبہ کے یہاں کھانوں پر ایک سیمینار کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک صاحب نے بتایا کہ ''ان کی تحقیقات کی رو سے کالج کا کوئی طالب علم نہ تو شرعی گواہ

ہوسکتا ہے نہ کسی الیکشن میں ووٹر، اس لیے کہ جب تک کالج کی تعلیم حاصل کرتا اور ڈائنگ ہال کا کھانا کھاتا رہے گا، نہ عاقل ہوسکتا ہے نہ بالغ''۔ اس صورت حال کو آپ پلٹ دیں تو ہمارے جامعہ کے مطبخ کا کردار روشن ہو جائے گا۔

تابش مہدی صاحب کی طرح ہم بھی غالب کے طرفدار نہیں البتہ میں غالب کا اس امر میں پیرو کار ہوں کہ ہمارے گھر کی رونق ہمیشہ ایک ہنگامے پر موقوف ہوتی ہے۔ مطبخ کی گہما گہمی اور زندگی کی پر لطف کشا کش کو دیکھنے والی ان آنکھوں کو ٹفن کی بے کیفی کا منظر معلوم نہیں کیسا محسوس ہوگا۔ فلاح میں مطبخ طعام و شرب پر مبنی محض ڈائنگ ہال جیسا محدود تصور نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ ایک تربیت گاہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے تربیت یافتہ فلاحی بڑے سے بڑے اجتماع، پارٹی اور کھانے پینے کے نظم و انصرام کے حوالے سے ہمیشہ قابلِ اعتماد پائے گئے۔ ہم نے جگہ جگہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا اور داد و تحسین پائی۔ بلاشبہ یہ فلاح کے نظامِ مطبخ کی عملی تربیت کا فیض تھا۔ فلاح کے قیام سے ہی وہاں کے مزاج میں تحریکیت کے سبب اس کا ہر گوشہ اسی مخصوص رنگ کا حامل ہوتا چلا گیا۔ مطبخ میں یہ رنگ کچھ زیادہ ہی نکھرا تھا۔ یوں تو آج بھی فلاح کے نظام میں حرکت و عمل اور تحریکیت کی کھنک باقی ہے، مگر معلوم نہیں مجھے کیوں یہ احساس گزرتا ہے کہ اجتماعی نظامِ طعام کے خاتمے کے ساتھ فلاح کے نظام میں عملی سطح پر تربیت کا ایک مضبوط عضو اس کے سالم جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے۔ میرے مربی استاذ اور سابق مہتمم جامعۃ الفلاح مولانا عبدالحسیب صاحب نے بتایا کہ ''مولانا علی میاں ندویؒ فلاح آئے تو مطبخ کے نظام سے بے حد متاثر ہوئے، انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ایسا نظام ندوہ میں بھی قائم ہو جائے تو بہتر ہے؛ ہمارا بہترین نظام تو وہاں منتقل نہیں ہو سکا البتہ وہاں کے ٹفن سسٹم نے ہمارے مثالی مطبخ کی جگہ لے لی''۔ یہ باتیں انھوں نے جس تأسف کے ساتھ کہیں، اس کا مدعا جامعۃ الفلاح کے موجودہ اربابِ مجاز پر یقیناً واضح ہو چکا ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انتظامیہ کے سامنے ایک جدید ڈائنگ ہال کا خاکہ بھی تھا، اب جبکہ ٹفن سسٹم کا خاصا تجربہ ہو چکا، مطبخ کی جانب مراجعت کی کوئی سبیل نکل آئے تو اس ثمر آور نظام سے ہماری نئی نسل کو بھی فیض پہنچے۔ میرے نزدیک جامعۃ الفلاح کا میس (Mess) گارے مٹی اور کھپریل کی چھت رکھنے والی سرد اور بے جان کچی عمارت نہیں بلکہ اس کے اولوالعزم معماروں کی پُر جوش اور گرم خون شخصیت تھی۔

منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ

کعبۂ روح مسلماں ہیں علی مرتضٰی
قبلۂ تقدیر مرداں ہیں علی مرتضٰی

پیکرِ ایمان وایقاں ہیں علی مرتضٰی
پرتوِ آیات قرآں ہیں علی مرتضٰی

علم وعرفاں کا مدینہ ہیں نبی محترم
اور باب علم وعرفاں ہیں علی مرتضٰی

رزم گاہ خیر وشر ہو یا ہو بزم دوستاں
حق کی خاطر تیغ برّاں ہیں علی مرتضٰی

زیست ہے ان کی عبارت غیرت اسلام سے
عظمت حق کے نگہباں ہیں علی مرتضٰی

اُن کی ہیبت سے ہیں لرزاں عصر کے طاغوت بھی
امتیاز کفر وایماں ہیں علی مرتضٰی

صرف خیبر ہی نہیں ہے ان کی قوت کا ہدف
غارتِ اقلیم عصیاں ہیں علی مرتضیٰ

مرحب وعنتر بھی ہیں صید مذاق ذوالفقار
ضربت شمشیر یزداں ہیں علی مرتضیٰ

اُن کی قوت ہے رہین منت نانِ شعیر
فقر واستغناء کے سلطاں ہیں علی مرتضیٰ

خانقاہوں میں کہاں ہے رسم وراہ حیدری
محرم اسرار عرفاں ہیں علی مرتضیٰ

شیخِ ہندی دے رہا ہے دعوت ترکِ جہاد
حکمت ہندی پہ خنداں ہیں علی مرتضیٰ

کفر کے شانہ بشانہ دعوت حق کی صدا
اس صدائے حق پہ حیراں ہیں علی مرتضیٰ

ضرب ''لا'' سے توڑ دے راشدؔ بتان عہد کو
تیرے ''الا ھوٗ'' پہ نازاں ہیں علی مرتضیٰ

سید راشد حامدی فلاحی،
شاہین باغ۔نئی دہلی،
موبائیل نمبر:9811126467

غزل

خمار بادۂ الفت کا مجھ پر کچھ اثر بھی ہے
کسی میخانۂ امید میں میرا گزر بھی ہے
بشر کی دسترس اے محوِ حیرت چرخ پر بھی ہے
زمیں پہ رہنے والے کو ستاروں کی خبر بھی ہے
مری آنکھوں پہ اسرار محبت آشکارا ہیں
حدودِ قلب میں میری نگاہوں کا گزر بھی ہے
کوئی ظلمت گہہ عالم میں جاکر یہ خبر کردے
مجھے اب اعتبار جلوۂ نور سحر بھی ہے
میری تخریب میں تعمیر کا پہلو بھی مضمر ہے
مجھے اندیشۂ شب بھی ہے امیدِ سحر بھی ہے
کسی کے عارضِ گل رنگ پہ ٹھہرا ہوا آنسو
بظاہر ایک قطرہ ہے جو سمجھو تو گہر بھی ہے
تجاہل عارفانہ ہے تعارف جاہلانہ ہے
وہ میرے حالِ دل سے باخبر بھی بے خبر بھی ہے
مجھے اب بھی گلستاں کی فضائیں یاد آتی ہیں
میرا ذوق جنوں اختؔر ابھی نامعتبر بھی ہے

اختر عظیم آفاقی فلاحی مرحوم،
راجستھان

غزل

بجھی بجھی ہوئی آنکھوں میں گوشوارۂ خواب
سو ہم اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں خسارۂ خواب

وہ اک چراغ مگر ہم سے دور دور جلا
ہمیں نے جس کو بنایا تھا استعارۂ خواب

چمک رہی ہے اک آواز میرے حجرے میں
کلام کرتا ہے آنکھوں سے اک ستارۂ خواب

میں اہل دنیا سے مصروف جنگ ہو جاؤں
کہ پچھلی رات ملا ہے مجھے اشارۂ خواب

عجب نہیں میری نیندیں بھی جل اٹھیں اس بار
دبا ہوا میرے بستر میں ہے شرارۂ خواب

سالم سلیم،نئی دہلی
موبائیل نمبر:9540601028

غزل

دیکھ لے گی خلق میری بے گناہی ایک دن
وقت خود دے گا ترے حق میں گواہی ایک دن

آنکھ سورج کو دکھاتا ہے چراغ کم عیار
منکشف ہوگی خود اس کی کم نگاہی ایک دن

کثرت زر ہے دلیل برتری تو دیکھنا
پارہ پارہ شیشہ دل کی تباہی ایک دن

کس لیے اندیشۂ فردا لیے پھرتے ہو تم
خود بھی ہوگا یہ نشاں ظل الٰہی ایک دن

ایک ہلکی سی ہوا میں اُڑ گیا رُخ سے نقاب
زاویہ بدلے گی اپنی کجکلاہی ایک دن

آ گیا ہے جب محبت میں غم سود و زیاں
لوح دل پر پھیل جائے گی سیاہی ایک دن

ڈاکٹر عبدالرشید راشد،
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
موبائیل نمبر:09953236119

غزل

خوش ہوگا رب تو برسے گی رحمت نماز سے
ہم سب کے گھر میں آئے گی برکت نماز سے

ہوتی ہے دور قوم کی نکبت نماز سے
حاصل جہاں میں ہوتی ہے عظمت نماز سے

ہوتی ہے آنکھ ٹھنڈی نبی کی، نماز سے
اچھی نہیں ہے دوستو غفلت نماز سے

قائم رکھو نماز تو قائم رہے گا دین
قائم ستوں ہے دین کا حضرت! نماز سے

نفرت بھی ہوگی دور کدورت بھی ہوگی دور
پیدا دلوں میں ہوتی ہے شفقت نما زسے

تم سجدہ ریز ہو کے خدا سے کرو دعا
پوری ہرایک ہوتی ہے حسرت نماز سے

سچ بات کہہ رہا ہے یہ خلاؔد دوستو
ملتی ہے دوجہان کی دولت نماز سے

صادق ظلی فلاحی (خلاد اعظمی)،
موبائیل نمبر:08130731779

غزل

رہنے لگے ہیں سانپ اب ایسے جہان میں
ہروقت خوف رہتا ہے جن سے مکان میں

قاتل اُنھیں کہے گا کوئی کس زبان سے
دشمن کو بھی جو رکھتے ہیں اپنی امان میں

میں نے تو صرف پھولوں کے پودے لگائے تھے
خنجر کہاں سے آئے ہیں یہ سائبان میں

لکھی وفا کی میں نے کہانی اگر کبھی
تیرا بھی نام ہوگا مری داستان میں

کب تک وہ رہ سکے گا سلامت پتہ نہیں
کٹ کرز میں سے اڑتا ہے جو آسمان میں

وہ بھی بنا ہے شاعراردو زباں ضمیرؔ
لکھتا نہیں ہے شعر جو اردو زبان میں

ضمیر اعظمی فلاحی،
مرکز جماعت اسلامی ہند
موبائیل نمبر:9810915189

تعارف وتبصرہ

نام کتاب: شورخاموشی (شعری مجموعہ)

شاعر: اشتیاق دانش

اشاعت: ۲۰۱۵ء

صفحات: ۲۶۰/

ناشر: کوجو پریس، انصاری روڈ، دریا گنج۔نئی دہلی

مبصر: سالم سلیم، نئی دہلی، موبائیل نمبر: 09540601028

زیرتبصرہ شعری مجموعہ ''شورخاموشی'' نظرنواز ہوا۔ظاہری تزئین اور ٹائٹل کے باوصف ذرا دلچسپی پیدا ہوئی اور پہلی ہی نشست میں اکثر غزلیں پڑھ گیا۔کتاب کے آخری صفحہ پر اشتیاق دانش کی کثیرالجہتی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مگر مجھے اس وقت ان کی شاعرانہ حیثیت سے سروکار ہے۔اشتیاق دانش کی بیشتر شاعری پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کے یہاں خارجی بیان حاوی ہے۔یہ شاعری نہ روایتی ہے، نہ روایت سے انحراف کرتی ہے، بلکہ اکثر شاعری ''موزوں گوئی'' (اور بعض جگہوں پر ''ناموزوں گوئی'') کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

جب ہم اپنے احساسات کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں تو شعر کے بھی ہم سے کچھ مطالبات ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا تخلیق کار کے لیے اشد ضروری ہے۔کوئی بھی واقعہ یا واردات جب تک آپ کا ذاتی تجربہ نہ بنے تب تک شعر کا ''ہونا'' باقی رہے گا۔یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ شاعری صرف کلام موزوں نہیں ہے (گوکہ شاعری کی پہلی شرط کلام کا باوزن ہونا ہی ہے) بلکہ انسان کے باطن سے پھوٹنے والی روشنی کا نام ہے۔''شورخاموشی'' میں اپنے احساسات کو سادہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مستحسن ہے

مگر کئی جگہوں پر شاعر سخت عاجزی کا شکار نظر آتا ہے۔اسی لئے اس مجموعے کے اندر ایک نہیں بلکہ کئی آنچ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال بعض ایسے اشعار نظر سے گزرے جن پر چونکے بغیر نہیں رہا جاسکتا، کاش کہ شاعر اس تسلسل کو برقرار رکھتا۔

یہ شب وصل بھی آئی تو بھلا کب آئی
حوصلہ جب نہ رہا دل میں خطا کرنے کا

مرے خدا یہ مجھے دیکھ کتنا تنہا ہوں
بھرے جہاں میں اکیلا اداس رہتا ہوں

تھا حکم ان کا چلے آئے بزم سے اٹھ کر
پہ مڑ کے دیکھا تو آنکھوں کو ان کی نم پایا

ہماری خاک ہوئی سرخ رو کہاں دیکھو
وہاں جہاں پہ فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں

ایک دنیا مرے گھر آئی ہے تیری خاطر
تم نہ آئے تو نگاہوں سے اتر جاؤں گا

اشتیاق دانش نے نظموں میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ان کی نظم ''پرندہ''، ''خدا تجھے میں نے پالیا ہے'' نسبتاً بہتر نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔آخر میں بطور مثال ایک فہرست دے دینا مناسب ہے جہاں بحر، وزن اور زبان کی فاش غلطی در آئی ہے، شاید صاحب مجموعہ سے عجلت میں ایسا ہو گیا ہو، بہر حال اب یہ تیر ان کی کمان سے نکل گیا ہے۔

(۱) صفحہ ۷ ر پر تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ بے وزن ہے۔
(۲) صفحہ ۱۲ ر مطلع کے پہلے مصرعہ کا قافیہ درست نہیں ہے۔
(۳) صفحہ ۱۲ ر چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ بے وزن ہے۔
(۴) صفحہ ۱۹ ر مطلع کا دوسرا مصرعہ خارج از وزن ہے۔
(۵) صفحہ ۳۱ ر مطلع کا پہلا مصرعہ بے بحر ہے۔

(۶) صفحہ ۳۲ / دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے ''بزم بہار کی ہم نے'' غلط ہے۔
(۷) صفحہ ۹۹ / مطلع کا پہلا مصرعہ بے وزن ہے۔
(۸) صفحہ ۱۰۳ / تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ بے بحر ہے۔
(۹) ۱۱۹ / مطلع کا دوسرا مصرعہ مرض بروزن فَعَل درست ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے۔
(۱۰) صفحہ ۱۲۷ / یہ بحر شاعر کو جُل دے گئی ہے۔ کئی مصرعے بے بحر ہیں۔

کتاب کی طباعت خوبصورت ہے۔ ''شور خاموشی'' جیسی تخلیقی ترکیب وضع کرنے پر تہہ دل سے مبارکباد۔

نام کتاب: افکار ابن تیمیہؒ

انتخاب و ترتیب: پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ

ترجمہ: ضمیر الحسن خاں فلاحی

صفحات: ۱۷۴ / ، **اشاعت:** نومبر ۲۰۱۴ء ، **قیمت:** ۹۰ / روپے

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

مبصر: محمد صادق ظلی فلاحی

جب جب سماج میں بگاڑ اور خرافات کا بول بالا ہوتا ہے، عقائد وافکار پستی کی ساری حدیں پار کر جاتے ہیں، خوف ودہشت، بدامنی اور بدعات وتوہمات ہر چہار سو ڈیرے ڈال دیتے ہیں، تو کوئی مصلح، مجدد اور بطل جلیل جنم لیتا ہے، اور پوری ہمت وجرأت کے ساتھ سماجی برائیوں کی اصلاح کا علم بلند کرتا ہے اور بگاڑ کے خاتمے کے لیے اپنی پوری مساعی صرف کر دیتا ہے، اور آخری سانس تک اسی جذبے، خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے مشن سے وابستہ رہتا ہے۔

پیش نظر کتاب بھی ایک ایسے ہی بطل جلیل اور مصلح قوم کے افکار کا حسین گلدستہ ہے، جسے عالم اسلام ''مجدد اسلام شیخ احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہؒ، متوفی ۱۳۲۸ء'' کے نام سے جانتا ہے۔ امام موصوف نے تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کی غارت گری اور مراکز تعلیم کی تباہی کے بعد جبکہ بدعات وخرافات نے دین کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور کتاب وسنت سے تعلق بھی قابل گردن زدنی جرم تصور کیا جانے لگا تھا، ایسے پرخطر دور میں خطرات وخدشات کی پرواہ کئے بغیر، صحیح اسلامی عقیدہ وفکر کی تجدید اور عوام الناس کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا، اور اپنے تجدیدی افکار سے گلشن اسلام کی آبیاری کی۔ امام شہیدؒ کی

شخصیت اور ان کے افکار موجودہ دور میں محتاج تعارف نہیں ہیں، مختلف زبانوں میں مرحوم کی حیات وخدمات پر متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور رسائل وجرائد کے ہزاروں صفحات سیاہ کئے جاچکے ہیں، مگر تشنگی کا احساس جوں کا توں ہے۔ علامہ موصوف کی شخصیت، کارنامے، اور فکر وفن پر جتنا بھی مطالعہ کرلیا جائے دل ہے کہ هَل مِن مَزِیدٍ کے تقاضے سے باز نہیں آتا۔

زیر تبصرہ کتاب سابق امیر جماعت اسلامی ہند پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ، متوفی ۲۰۱۲ء کی منتخب اور مرتب کی ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم کا اختصاصی میدان فلسفہ اور تصوف ہونے کی وجہ سے انہوں نے متعدد مسلم مفکرین اور فلاسفہ کے افکار کا تفصیلی اور تجزیاتی مطالعہ کیا تھا، ان میں ایک نمایاں نام علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے کافی متاثر تھے۔ عبدالحق انصاریؒ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے مجموعہ فتاوی اور دیگر تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے بہت سے اقتباسات جمع کئے تھے اور مختلف موضوعات کے تحت انہیں سلیقے سے مرتب کر کے ان کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، اور یہ ترجمہ ''Ibn Taymiyyah Expounds on Islam'' ۲۰۰۰ء میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض سے شائع ہوا تھا، اور اب اردو ترجمہ افکار ابن تیمیہ کے نام سے طبع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب علامہ موصوف کے افکار پر تحریر کی گئی کتابوں میں سرفہرست ایک بہت ہی معلوماتی، مفید، معیاری، مؤثر اور جامع کتاب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوزے میں سمندر سمودیا گیا ہے۔ یہ ایک زبردست علمی وتحقیقی شاہکار ہے جسے ہاتھوں ہاتھ لیے جانے اور زیادہ سے زیادہ اس سے فیضیاب ہونے کی ضرورت ہے۔

۴۷۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور پھر ہر باب کی مختلف ذیلی عنوانات کے ذریعے تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ الغرض کتاب کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ یہ کتاب ترجمہ ہے مگر دوران مطالعہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی زبان سادہ، سلیس، صاف ستھری اور رواں ہے۔ مترجم ضمیر الحسن خاں فلاحی نے ترجمہ کے میدان میں ایک کہنہ مشق مترجم کی طرح ترجمے کی فنی باریکیوں کو بخوبی برتا ہے۔ عرق ریزی اور احساس ذمہ داری کے لیے مترجم محترم ضمیر الحسن خاں فلاحی صاحب کو دلی مبارکباد۔

آپ کے خطوط

الحمدللہ گزشتہ شمارے سے متعلق قارئین کے تاثرات کافی بڑی تعداد میں موصول ہوئے، البتہ صفحات کی قلت کے سبب جملہ تاثرات کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ یہاں معذرت کے ساتھ محض چند خطوط کی اشاعت پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ **مدیر)**

پروفیسر محسن عثمانی، حیدرآباد۔ ای میل:
profmohsinusmani@gmail.com

آپ کے ہاتھ سے مجلّہ حیات نو ملا اور رفیق منزل بھی باصرہ نواز ہوا۔ پڑھنے کا فوراً وقت نہ ملا، مسلسل سفر درپیش تھا۔ دہلی سے کلکتہ، وہاں کانفرنس تھی، پھر پٹنہ اور پھلواری شریف اور بہار شریف، دہلی واپس آتے ہی پھر اعظم گڑھ کا سفر، دارالمصنفین میں ایک لکچر تھا اور جامعۃ الفلاح میں ایک پروگرام میں شرکت، پھر لکھنؤ وہاں ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ تھا۔ دہلی آیا تو زبان پر یہ شعر ؎

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اور زبان پر یہ آیت تھی: لَقَد لَقِینَامِن سَفَرِ نَا هَذَانَصَباَ۔

بعد میں ان رسالوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ آپ ماشاء اللہ ٹھہرے دو رسالوں کے مدیر اور وہ بھی خوش تحریر، قلم کے دھنی، اللہ غنی۔ پھر اسی کے ساتھ میدان کے شہسوار۔ دونوں رسالوں کے مشمولات بہت اچھے ہیں۔ حیات نو میں تمام علمی اور ادبی ماہناموں کا اشاریہ بھی اگر شامل کرلیں تو افادیت بڑھ جائے گی اور طلبہ کے ذوق تحقیق کو جلا ملے گی، انہیں معلوم ہوگا کہ کس موضوع پر کس رسالہ میں مضمون شائع ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نوجوانوں کو مشورہ دیجئے کہ وہ کوالیفیکشن حاصل کریں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں ''إِنِّی حَفِیظٌ عَلِیمٌ'' (میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں) اپنی اپنی فیلڈ میں اگر پرفکشن (کمال) حاصل ہوگیا تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں گی ''ائتُونِیْ بِهِ أَستَخلِصهُ لِنَفسِی'' (اسے میرے پاس لاؤ میں اسے اپنا

مصاحبِ خاص بناؤں گا) حفظ وامانت اور علم ومہارت کسی کو کسی میدان میں حاصل ہو جائے تو دنیا اس کی قدردانی پر مجبور ہوتی ہے۔ اس پیغام کو تمام نوجوانوں تک پہونچا دیجیے۔

مرے قافلہ میں لٹا دے اسے　　　لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

عمر افضل، امریکہ۔ ای میل:omarafzal1@yahoo.com

حیات نو کا تازہ شمارہ آپ کی نوازش سے دیکھنے کو ملا، بہت بہت شکریہ۔

ڈاکٹر محی الدین غازی کا مضمون ''اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۷) دیکھا۔ موصوف کا یہ کہنا کہ ''ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے''۔ یہ بہت ہی سنجیدہ تأثر ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد اہم اشوز ہیں جن کے تعلق سے اس مشورے پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کے لیے ان ماہرین کو حاصل کرنا چاہئے جو اجتماعی طور پر کام کرنے کی خواہش رکھتے ہوں، اور ان کے لیے مناسب سہولیات فراہم کی جانی چاہئیں۔ میں نے ایسا ہی ایک مشورہ آج سے قریب تیس سال قبل ۱۹۷۸ء میں MSA-USA کو دیا تھا، اس کی پانچ رکنی انتظامی کونسل کا ممبر ہونے کی حیثیت سے، لیکن کبھی بھی اس مشورے کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ برادرم مولانا امانت اللہ اصلاحی کے افادات سے، بالخصوص تدبر قرآن پر، بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئے۔ فارغین جامعۃ الفلاح کی مختلف تحریروں نے درسگاہ اسلامی رامپور کی یاد تازہ کردی۔

ذاکر حسین فلاحی، معتمد عام اسلامی جمعیت طلبہ جموں وکشمیر، ای میل: ibnsharief222@gmail.com

سہ ماہی مجلّہ حیات نو (جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء) مدیر برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی کے ذریعے دیکھنے کو ملا، خوشی ہوئی۔ اس مجلّہ سے میری نسبت کی دو اہم وجوہات ہیں، ایک جامعۃ الفلاح سے فراغت کی نسبت اور دوسری برادر مدیر سے قریبی تعلق۔ برادر موصوف کے ساتھ تقریباً ایک دہائی کا عرصہ علمی سفر میں گزرا، اور اب تحریکی ودعوتی میدان میں بھی ہم سفر ہیں، اس طرح ان سے علمی وفکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ قلبی لگاؤ بھی ہے۔ الحمدللہ مجلّہ میں ماضی کی بہ نسبت بہتر مضامین کا انتخاب دیکھنے کو ملا، جس میں تنوع کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ انجمن طلبہ قدیم کا یہ ترجمان فلاحی برادران کے افکار وخیالات کا عکاس ہے اور ساتھ ہی ان کے لئے آپسی تعارف اور رابطہ کا ذریعہ بھی۔ ''فکر وآگہی'' کالم کے تحت ''دعوت اسلامی میں خواتین کا مطلوبہ کردار'' ایک سنجیدہ علمی بحث مفید معلوم ہوئی۔ اور ''وہ ایک لمحہ''، ''شعر ونغمہ''

اور ''آرزوئیں اب بھی یوں ڈھونڈتی ہیں آپ کو'' کافی دلچسپ لگا۔ برادر موصوف کی ادارت کے بعد مجلّہ میں جدت اور تنوع کے ساتھ ساتھ تحریک وحرارت میں بھی اضافہ ہوا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اصحاب علم وفضل اوراجتہادی ذہن رکھنے والے باصلاحیت فلاحیوں کی شمولیت اور وسیع تر نمائندگی کے ذریعے قلمی دائرے کو مزید وسعت دی جائے تاکہ نت نئے اور جدید مسائل کا علمی حل تلاش کرکے تحریک اسلامی کے دعوتی کام کو ہموار وسہل بنایا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ برادر مدیر کی صلاحیتوں میں مزید نکھار عطا کرے اور انہیں اجر سے نوازے۔آمین۔

کلیم احمد اصلاحی، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔موبائیل نمبر: 0540593066

سہ ماہی حیات نو کا باضابطہ قاری ہونے کی وجہ سے مجھے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حیات نو دن بدن اپنی ترقی کی مسافتیں طے کررہا ہے اوران شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب یہ ہندوپاک سے شائع ہونے والے اردو مجلّات میں سرفہرست شمار کیا جائے گا، اورارباب علم وفن اس کو بطور استناد وحوالہ استعمال کریں گے۔ ادھر تقریباً دو سالوں سے جس طرح کے نت نئے مضامین کی شروعات ہوئی ہے اس نے نہ صرف اس کی قدر وقیمت میں اضافہ کیا ہے بلکہ قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔اس کے اسلوب اور طرز نگارش کو دیکھا جائے تو کسی طور پر یہ ایک ادبی پرچے سے کم درجہ نہیں رکھتا۔ جناب نسیم غازی صاحب کا طرز واسلوب، موجودہ مدیر کے تبصرے اوراستاذ شاگرد کے درمیان علمی مسئلے کو لے کر خط وکتابت نے اس مجلّے میں چار چاند لگادیئے ہیں، استاذ اور شاگرد کی یہ مراسلت ہمیں بزرگوں کی یاد دلاتی ہے کہ کس طرح ایک شاگرد اپنے استاذ سے حسن وخوبی کے ساتھ مؤدب انداز میں اختلاف کرتا ہے اوراستاذ کو بار بار محنت کرنے پر اکساتا ہے۔ بہر حال حیات نو کے تمام ہی مضامین عمدہ اور لائق تحسین ومبارک باد ہیں۔ جناب مدیر کی انتھک کوشش کا یہ بہترین ثمرہ ہے، امید ہے کہ آئندہ اس میں مزید بہتری آئے گی، اللہ آپ کو مزید حوصلہ اورصبر واستقامت سے نوازے، آمین ثم آمین۔

ثناء اللہ، شعبۂ تعلیم، مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی

تھوڑے عرصے کے فرق سے حیات نو کے دو شمارے موصول ہوئے۔ ان دونوں شماروں (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء، جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء) میں مضامین اچھے ہیں۔ ویسے جب سے آپ کی ادارت میں یہ رسالہ آیا ہے، اس کو ایک نئی حیات مل گئی ہے۔ اب یہ اسم بامسمّی (حیات نو) ہوگیا ہے۔ مضامین کے تنوع کے علاوہ ان دونوں شماروں میں دعوتِ اسلامی، اس کے مسائل اوراس تعلق سے امت مسلمہ کی موجودہ

صورتِ حال پر اظہار خیال کرنے والوں نے بیش بہا مواد فراہم کیا ہے جس پر سنجیدگی سے غور وفکر ہونا چاہیے۔ اس میں فارغین مدارس کی قید نہیں ہونی چاہیے۔ دعوت کا کام تو پوری امت مسلمہ کی منصبی ذمہ داری ہے۔ مدارس کے طلبہ دین کا علم حاصل کرتے ہیں، اس لئے ان پر یہ ذمہ داری زیادہ آجاتی ہے۔

مدرسے سے واقفیت رکھنے والے لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہر مدرسہ ایک خاص مسلک کا ترجمان ہوتا ہے اور ہر مسلک باہم ایک دوسرے کا حریف بھی۔ ایسی صورت میں مدرسوں کو دین کا قلعہ سمجھنا اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو دین کا سپاہی سمجھنا خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہاں ان میں سے کچھ لوگوں کو، اپنی تلاش وجستجو کی بدولت، اللہ تعالیٰ شعورِ حق عطا کرتا ہے۔ مگر یہ استثنائی صورت حال ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے مدرسوں کے بارے میں یہ ریمارک دیا تھا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ؟

ایک صدی گزر جانے کے بعد ہنوز صورت حال وہی ہے بلکہ اور زیادہ ابتر ہے۔ مضمون نگار حضرات میں سے بعض کو اس کا احساس ہے، یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ مرض مزمن ہے، اس کی صحیح تشخیص ہوجانے پر ہی اس کا علاج ممکن ہے۔

محترم ظفر احمد اثری صاحب (لندن) کا مضمون انتہائی قیمتی ہے۔ انہوں نے دس نکات میں جو مشورے دیئے ہیں وہ لائق توجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

مولانا نسیم احمد غازی فلاحی صاحب نے ایک عمدہ اور علمی مشورہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''معروف وقابل ذکر مدارس کے نمائندوں کو ایک مقام پر جمع کیا جائے جہاں اس بات پر غور ہو کہ کار دعوت کے سلسلے میں مدارس کیا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اپنے نصاب تعلیم میں اس پہلو سے انہیں کیا ترمیم کرنی ہے، اور کیا لائحہ عمل بنانا ہے۔ اس کام میں ہمارے فقہی وجزوی اختلافات کو مانع نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامی بنیادوں پر ہمارا اتحاد ہی ہماری کامیابی کی کنجی ہے۔ ہر مکتب فکر اور ہر مسلک کے علماء کو اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ اپنے فکری اور مسلکی اختلافات کو ان کے جائز حدود میں رکھیں اور عملاً اس بات کا ثبوت دیں کہ ہم سب ایک امت ہیں۔'' (حیات نو، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء، ص: ۲۹)

ممکن ہونے کے باوجود یہ کام کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ صاحب بصیرت لوگوں کو ہوگا۔

محترم نعیم احمد غازی فلاحی صاحب کا مضمون دعوتی روح کو جلا بخشنے والا ہے۔ کارِ دعوت کو مارکیٹنگ اور بزنس سے تشبیہ دے کر انہوں نے اس کی اچھی تشریح کی ہے اور ''هل ادلكم علىٰ تجارة '' (سورة

الصّف) کی صحیح ترجمانی کی ہے۔اس کی عملی تطبیق کی صحیح صورت پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ان کے نکاتی مشورے بھی کافی اہم ہیں۔لیکن بات یہاں آ کر رک جاتی ہے کہ یہ سب کرے گا کون؟ انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ:''جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے، بلاخوف لومۃ لائم یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی بھی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس نے بحیثیت مجموعی دعوت دین کو اپنا مشن اور نصب العین بنایا ہو، اور اس انبیائی مشن کے لیے افراد سازی اور علمی و عملی تربیت ان کے نصاب تعلیم کا اہم جز وہو۔ملک کے طول وعرض میں پائے جانے والے مدارس پہ ایک عمومی نظر ڈالیے تو دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔''(حیات نو، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء، ص:۳۳)

یہ قنوطیت نہیں ہے بلکہ ان کو اس کا بھی اعتراف ہے کہ:''میں آج بھی بجا طور پر مدارس کو دین کے قلعے اور مدارس کے اساتذہ اور مربیوں کو اللہ کے بے لوث سپاہی سمجھتا ہوں، جو نہایت سخت حالات میں تحفظ دین کے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔''(حوالہ مذکور)

ان سے یہاں تعلق ہو رہی ہے۔علی الاطلاق یہ بات صحیح نہیں ہے۔وہ اگر اس میں اصلاح گوارہ کریں گے تو یوں فرمائیں گے:''مدرسوں کے فارغین میں سے ہی معدودے چند۔'' بحیثیت مجموعی ان کا مضمون چشم کشا ہے۔اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ذوالقرنین حیدر سبحانی صاحب نے بہت ہی اہم بات پر توجہ دلائی ہے۔دعوت کے لئے روٹین کی طرح کوئی معین وقت نہیں ہوتا۔اس کے مواقع ہوا کے جھونکے کی طرح ہر آن میدان میں آتے رہتے ہیں۔داعی کو اتنا حساس اور چوکس ہونا چاہیے کہ وہ اُس آن سے فائدہ اٹھالے۔اس سے بھی زیادہ کمال تو یہ ہے کہ معمول کی باتوں میں اور عام گفتگو کے دوران حکمت کے ساتھ دعوت کے لئے سازگار ماحول خود سے تخلیق (Create) کرلے۔اور زمین ہموار ہوتے ہی اس میں اپنا بیج ڈال دے۔بروقت چیزوں کا اثر گہرا اور دوہرا ہوتا ہے۔عملی میدان میں کام کرنے سے خود یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔اس کے لئے کسی کتاب اور تربیت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ان کوائف کو الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔سچائی میں وہ قوت ہے جس سے بدترین قسم کے دشمن کا دل بھی پگھلایا جاسکتا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

ذوالقرنین صاحب کے الفاظ میں:''دعوت دین کا کام باقاعدہ ایک الگ شعبے کے طور پر کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی بہت کارآمد۔دعوت کا کام ایک مخصوص قسم کی روٹین کے لئے ہمہ وقتی فراغ بھی نہیں چاہتا۔دعوت ہر مسلمان کی منصبی ذمہ داری ہے۔جو اسے ہر میدان اور ہر مشغولیت میں رہتے ہوئے ادا

کرنی ہوتی ہے۔۔۔۔دعوت نہ تو اتنا معمولی اور غیر اہم کام ہے کہ ہر کام اور میدان میں ناکام ہو جانے والا شخص اس کو اپنا میدان اور زندگی کا پیشہ بنالے، اور نہ ہی اتنا آسان اور ہلکا کام ہے کہ جو آدمی کسی بھی میدان میں اپنی صلاحیت ثابت نہ کر سکے اور کسی بھی فن میں مہارت حاصل نہ کر سکے وہ دعوت کو اپنے تخصص کا موضوع بنالے۔''

مزید آگے لکھتے ہیں: ''بدقسمتی سے آج ملت اسلامیہ بالعموم اور مدارس اسلامیہ بالخصوص دعوت کے تعلق سے ایک مردہ، بے روح اور بے کیف تصور رکھتے ہیں، اور اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ خود دین کے تعلق سے وہ ناقص اور بے جان تصور کے حامل ہوتے ہیں۔۔۔۔دعوت کے تعلق سے اہل مدارس کے یہاں اس قدر غیر ذمہ داری اور کوتاہ نظری کا ثبوت ملتا ہے کہ لوگ یہ تک کہنے پر مجبور ہوئے کہ دعوت کے کام اور طریقہ اور نظریہ کو سب سے بڑا نقصان اہل مدارس سے پہنچا ہے۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ مدارس دین اور پھر دعوت دین کے جس تصور کے حامل ہوتے ہیں وہ دعوت کے لئے بھی ایک منفی اثر رکھتا ہے اور دین کی امیج کو بھی متاثر کرتا ہے۔'' (حیات نو، اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۴ء، ص:۴۳ر۴۴ر)

مذکورہ بالا باتیں کڑوی ضرور ہیں مگر صداقت پر مبنی ہیں۔ جتنا نقصان اہل مدارس نے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کو پہنچایا ہے، اس کا عشر عشیر بھی دشمنان اسلام نے نہ پہنچایا ہوگا۔ انہوں نے ملت کے فکری اور تعمیری قویٰ کو مضمحل اور بالآخر معطل کر کے ایسی خانہ جنگی کا محاذ کھول رکھا ہے جس سے پوری ملت لہو لہان اور اشک بار ہے۔ پھر بھی وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ مسلمان اور اسلام کا نام ہمارے ہی دم سے باقی ہے۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں:

''اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کی کسی تبدیلی کے بھی روادار نہیں، بلکہ اس قدامت پرستی کو اپنے لئے فخر کا باعث سمجھتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر اس کی وکالت کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص:۴۴)

آگے صورت حال کی اصلاح کے لئے تجاویز بھی درج ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ سب تدبیریں اُلٹی پڑتی جاتی ہیں اور کوئی دوا کارگر نہیں ہو پاتی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارے ناقدین اور مضمون نگاران کہاں سے آئے ہیں؟ وہ بھی تو ان ہی مدرسوں سے نکلے ہیں جن کی سیاہ اور ہولناک تصویر پیش کی جاتی ہے۔ جواباً بڑے ادب سے عرض ہے کہ آپ اس دھوکے میں نہ رہیں کہ یہ بول مدرسے نے سکھائے ہیں۔ یہ باغی تیور رکھنے والے تو ان کی نگاہ میں ملحد اور قابل گردن زدنی ہیں۔ لاکھوں میں سے چند افراد الگ سے محنت کر کے، خارجی ماحول اور دنیا سے یہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں، یا چند روشن دماغ اساتذہ جو مدرسوں کے عمومی ڈگر سے الگ ہٹ کر چلنے والے تھے، انہیں کے فیض سے کچھ لوگوں کو روشنی

ملی۔شاہ ولی اللہ،شبلی نعمانی،حمید الدین فراہی،ابوالاعلیٰ مودودی جیسے چند نمایاں نام ہیں،جن کی روشن ضمیری کا کریڈٹ مدرسوں کو ہرگز نہیں جاتا۔ان کی راہوں میں سنگ گراں حائل کرنے والے مدرسے کے فارغین ہی رہے۔اصل میں روایتی اسلام اور قرآنی اسلام میں بڑا فرق واقع ہو گیا ہے۔مدرسہ روایتی اسلام کا امین و پاسبان ہے۔قرآنی اسلام سے اس کو وحشت ہوتی ہے۔روایتی اسلام میں جمود ہے،اندرونی تضاد ہے۔اس بیماری سے چھٹکارا پانے میں مدرسوں کو اپنے وجود کا خطرہ نظر آتا ہے۔مردہ اسلام سے ہی اس کا مفاد وابستہ ہے۔اس لئے وہاں تبدیلی اور تحریک پنپ نہیں سکتی۔

بہر حال یہ چند مضامین پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ملت ابھی بانجھ اور مردہ نہیں ہوئی ہے۔اس سخت جاں ملت کے اندر نمو اور حیات باقی ہے۔اس لئے امید قوی ہے کہ اسلام کے اچھے دن آئیں گے، چاہے دیر ہی سے سہی۔

دوسرے شمارے (جنوری تا مارچ ۱۵ء) کا خصوصی موضوع ہے ’’دعوت اسلامی میں خواتین کا مطلوبہ کردار‘‘ اس کے تحت بھی نو مضامین لکھے گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے خواتین کے اندر بھی بڑی بڑی صلاحیتیں رکھی ہیں،ان کے اوپر بھی دین اور دعوت دین کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صدیوں سے مسلم خواتین کو محکوم اور محروم بنا کر رکھنے کا رواج عام ہے۔ایسی حدیثیں گھڑی گئیں جن میں عورتوں کو ناقص الدین اور ناقص العقل قرار دیا گیا،ان کو منحوس بنا کر کتوں کے زمروں میں شامل کر دیا گیا۔فقہی لٹریچر نے بھی عورت کو جائز مقام نہیں دیا۔معاشرے میں خواتین کے تئیں کوئی انقلابی سوچ اور منصوبہ بندی نہیں ہے۔مولانا نسیم احمد غازی فلاحی صاحب کی یہ بات خصوصی طور پر قابل توجہ ہے:’’منصوبہ بندی نہ ہونے کے سبب دعوتی میدان میں ایک بڑی آبادی کی صلاحیتوں سے ہم فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں جو ایک بڑا خسارہ ہے۔اگر اس کام میں باصلاحیت خواتین کا تعاون حاصل ہو جائے تو دعوتی کام میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور یہ ناممکن نہیں ہے۔‘‘(حیات نو،جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء،ص:۲۶)

محترم انعام اللہ فلاحی صاحب نے قرآن و حدیث کے حوالوں سے مزین اپنے مضمون میں نبوی دور کی سات خواتین کے داعیانہ جذبے اور اسلام کی خدمات کا ذکر سلیقے سے کیا ہے۔آخر میں چار توجہ طلب امور پر توجہ منعطف کرائی ہے۔اسی طرح جناب عنایت اللہ خاں فلاحی صاحب نے بھی عورتوں کے اندر داعیانہ صفات پیدا کرنے کے لئے پانچ نکاتی اہم مشورے دیئے ہیں۔محترمہ ام نبیل فلاحی صاحبہ نے بھی خواتین کی داعیانہ ذمہ داری پر توجہ دلائی اور ان کی کوششوں میں کوتاہیوں کا شکوہ بھی کیا

ہے۔ڈاکٹرحسن ترابی کا قول ''دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں سے سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ انھوں نے خواتین کی قوتوں اور صلاحیتوں کا بھر پور استعمال نہیں کیا ہے''، نقل کرنے کے بعد لکھتی ہیں:

'' چنانچہ جن ممالک میں اس جانب توجہ دی گئی جیسے سوڈان، ایران اور ملیشیا وہاں خواتین کی اسلامی تحریکات مختلف محاذوں پر سرگرم عمل ہیں، اور بین الاقوامی فورموں میں زیادہ تر انہی ممالک کی خواتین اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں۔'' (حیات نو، جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء، ص:۳۵)

جناب مصباح الباری صاحب فلاحی نے بھی اپنے مضمون میں صحابیات اور دیگر خواتین کی جوانمردی، حوصلہ اور دینی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔کوشش قابل قدر ہے مگر دو مقامات پر بڑی چوک ہوگئی ہے۔وہ لکھتے ہیں:''کتنی صحابیات ایسی تھیں جنہوں نے اسلام کی خاطر تکلیفیں برداشت کیں، لیکن ان کے ایمان میں جنبش پیدا نہ ہوئی۔'' (۴۴) یہاں جنبش کی بجائے ''لغزش'' لفظ مناسب ہوتا۔اکثر مصنفین اور واعظین نے حضرت عمر کے اسلام لانے کا سبب ان کی بہن کے استقلال کو قرار دیا ہے جیسا کہ مصباح الباری صاحب نے بھی لکھا ہے۔مگر حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا دوسرا واقعہ بھی سیر و تاریخ میں درج ہے اور وہ درایت کے اعتبار سے زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔عام مسلمانوں کی ذہنیت پر قومی جوش کا غلبہ زیادہ رہتا ہے جو اکثر غیر اسلامی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔داعی کو اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ نے مومن کو اور پیغمبر کو بھی دلائل و براہان کے ذریعہ اسلام کی دعوت دینے کا اختیار دیا ہے اور مدعو سے بھی دلیل کا مطالبہ کیا ہے (قُلْ هَاتُواْ بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔سورۃ البقرۃ:۱۱۱) مدعو کو یہ اختیار ہے کہ وہ دعوت قبول کرے یا رد کردے (فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُر ۔سورۃ الکہف:۲۹) دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے (لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۔سورۃ البقرۃ:۲۵٦) اسلام کفر کی حکمرانی کو ختم کرنا چاہتا ہے، کافروں کو نہیں۔کافروں کو دنیا میں جینے اور ترقی کرنے کا پورا حق اسلام دیتا ہے۔شیطانوں اور کافروں کا وجود اس دھرتی پر قیامت تک باقی رہے گا۔یہی اللہ تعالیٰ کی منشا ہے۔وہ بھلا کیسے گوارہ کرے گا کہ کافروں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ایسی صورت میں تو مقصد تخلیق (لِيَبْلُوَكُم) ہی فوت ہو جائے گا اور انسان کی آزادی ختم ہو جائے گی۔لیکن اکثر مسلمان غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ کفر کو مٹا دینا ہی ہماری ذمہ داری ہے، یا کار ثواب ہے۔اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔یہ غیر قرآنی سوچ ہمارے لاشعور میں رچ بس گیا ہے۔اسے کھرچ کر نکالنے کی ضرورت ہے۔اب دیکھئے جناب مصباح الباری صاحب کے مضمون کا ایک جملہ ''حق بلند کرنے، اور باطل کو

نیست و نابود کرنے کی جان توڑ کوشش کی۔۔۔‘‘(۴۴)۔ یہاں پر’’باطل کو نیست و نابود کرنے‘‘ کی جگہ’’ باطل کو سرنگوں کرنے۔۔۔‘‘ ہونا چاہیے۔

بحیثیت مجموعی مضامین اچھے ہیں اور عورت کی ذمہ داریوں اور حدودِ کار پر روشنی ڈالتے ہیں۔

محترم ضمیر الحسن فلاحی صاحب نے’’قرآن پاک میں اتحادِ امت کی بنیادیں‘‘ عنوان پر اچھی کوشش پیش کی ہے۔لیکن اس مضمون میں کئی مقامات پر غیر شعوری طور پر کچھ ایسے جملے لکھ گئے ہیں جن کی اصلاح ہونی چاہیے۔ایڈیٹر صاحبان کی بھی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسی چیزوں کی اصلاح کر کے اشاعت کے لئے بھیجیں۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:’’قرآن پاک نے جس پر امت کا اتفاق ہے، اسلامی توحید کے بعد جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اتحاد ہے اور اسلامی اخوت کو مجروح کرنے والی ہر چیز کو مٹانے اور ختم کرنے کی امت کو تاکید کی ہے۔۔‘‘(ص:۱۴)

قرآن صبر کرنے اور درگزر کرنے کی بار بار تلقین کرتا ہے تا کہ ہم اختلافات اور ناگوار چیزوں کو برداشت کرنے والے بنیں نہ کہ ایسی’’ہر چیز کو مٹانے اور ختم کرنے کی تاکید‘‘ کرتا ہے۔پھر آگے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں:’’اتحاد امت کا منشاء و مطلب یہ ہوا کہ امت،مسلک و مشرب،عقیدہ و نظریہ، ذات و برادری ،رنگ و نسل یا کسی دوسری چیز کو افتراق و انتشار کی بنیاد بنا کر کسی ایسی چیز پر مجتمع ہو جائے جو امت کے ہر فرد کو ایک لڑی میں پروتی ہو اور یہ لڑی اللہ کی رسی اور اللہ کی کتاب قرآن مجید ہو سکتی ہے۔‘‘(ص:۱۴)اس جملے کو دوبارہ پڑھئے۔کیا اس سے کوئی درست مطلب آپ نکال سکتے ہیں؟’’بنیاد بنا کر‘‘ کی جگہ’’بنیاد نہ بنا کر‘‘ کر دینے کے بعد بھی سقم باقی رہتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود قرآن کے بہت بڑے عالم اور صحابہ کے امام تھے۔اللہ کے رسول نے ان کو معلّم قرآن بنایا اور صحابہ کو تلقین کی کہ میرے بعد تم ان سے قرآن سیکھنا۔چار ایسے اشخاص کو معلم قرآن قرار دینا ایک گراں قدر اعجاز ہی نہیں، ایک سند لازوال بھی ہے۔قرآن کے تعلق سے ان کی شخصیت کو تشکیک کے دائرے میں لانا اُن پر ظلم ہی نہیں بلکہ رسول پاک پر بھی تہمت لگانے کے مترادف ہے۔لیکن اس بہتان عظیم کو ایک روایت کا سہارا پا کر لوگوں کو سر پر چڑھ کر بولنے کا حق مل گیا ہے کہ ابن مسعود قرآن کی دو سورتوں کو الحاقی مانتے ہیں، اور یہ کہ انہوں نے اپنے مصحف سے ان سورتوں کو کھرچ کر باہر نکال دیا۔سب لوگوں کو معلوم تھا اور کسی نے بھی ان کی مخالفت نہیں کی۔محترم ضمیر الحسن صاحب لکھتے ہیں۔’’حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی رائے قرآن مجید کی مکمل دو سورتوں کے سلسلہ میں پوری امت سے مختلف و منفرد تھی، ان کی رائے میں سورۃ الناس والفلق قرآن پاک کا جزو نہیں ہیں۔‘‘(ص:۲۰) یہ ہے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تصدیق شدہ معلم قرآن کی حالت- اس روایت کو تسلیم کرنے کے لئے جس معیار کی شہادت کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ کسی تفسیر یا کسی مستند حدیث کی کتاب میں اس طرح کی واہی روایات کے نقل ہو جانے سے اس کو استناد حاصل نہیں ہوسکتا، چاہے ناقل کتنا ہی بڑا امام اور ماہر فن کیوں نہ ہو۔

اگلے صفحہ پر موصوف ارشاد فرماتے ہیں: ''ہوا یوں کہ عہد صحابہ و تابعین کے بعد زمام خلافت جب ایسے نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو اس امانت کے کسی طور متحمل و اہل نہ تھے اور نہ احکام شریعت سے انھیں کوئی لگاؤ و تعلق تھا۔ مجبوراً نظام حکومت چلانے کے لیے انھیں علماء و فقہاء سے مدد لینی پڑی، گر چہ اس دور میں بھی ایسے با کردار اور صاحب عزیمت علماء تھے جو دین پر مضبوطی سے قائم رہے مگر اکثریت عزت و جاہ کی طلب اور ارباب حکومت کے مطلوب کی خاطر حصول علم میں لگ گئی۔'' (ص:۲۱)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ و تابعین کا زمانہ گزرنے کے بعد خلافت نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی، حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر (صحابہ کے دور) میں ہی نا اہلوں نے کاٹ کھانے والی خلافت قائم کر دی تھی۔ ظلم و فساد کی طغیانی بام عروج پر پہنچ گئی تھی۔ دینار اور تلوار (لالچ اور خوف) کے دو پاٹوں کے بیچ معاشرے کو پیس کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف عہد صحابہ و تابعین کے بعد علم و حکمت کے سوتے رواں ہوئے۔ سرکاری سرپرستی میں دینی و دنیاوی علوم میں پیش قدمی ہوئی۔ اسی اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء نے مجبوراً نظام حکومت کو ناقص قسم کے علماء کے حوالے کر دیا اور یہ کہ ان خلفاء کو احکام شریعت سے لگاؤ و تعلق نہ تھا۔ ''جب کہ اس دور میں بھی ایسے با کردار اور صاحب عزیمت علماء تھے جو دین پر مضبوطی سے قائم رہے'' تو پھر خلفاء کی مجبوری کیا تھی؟ یہاں کھلا تضاد ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ عہد مذکور میں امام ابو یوسفؒ جیسے با کردار نامور علماء سرکاری دربار میں اونچے منصب پر فائز تھے۔ تاریخ فہمی کا یہ کیسا نمونہ ہے! وہیں آگے یہ بیان آیا ہے کہ ''اسی دور میں فقہی و مسلکی اختلافات'' کی بنیاد پڑی اور اندھی تقلید کا مرض عام ہو گیا، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ فقہی اختلافات صدر اول میں بھی پائے جاتے تھے اور اندھی تقلید تو بہت بعد میں چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے شروع ہوئی۔

امید کی جاتی ہے کہ رسالہ کے آئندہ شمارے میں اشاعت سے پہلے اس پہلو سے بھی مضامین کی تصحیح پر توجہ دی جائے گی اور بہتر سے بہتر مضامین کی اشاعت سے قارئین فائدہ اٹھا سکیں گے۔

محمد آصف اقبال، (سیاسی وسماجی تجزیہ نگار) نئی دہلی

حیات نو کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء پڑھنے کا موقع ملا۔ تمام ہی مضامین عنوانات و مواد

کے لحاظ سے قابل قدر ہیں، ساتھ ہی شعر ونغمہ نے رسالے میں جان پیدا کردی ہے۔ رسالے کی خصوصیات میں یہ بات اہم ہے کہ تمام ہی قلم کار فارغین جامعۃ الفلاح ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسہ نے اب تک ایسے بے شمار طلبہ فارغ کیے ہیں جو دین کی خدمت مختلف پہلوؤں سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رسالہ کا مقصد غالباً فارغین فلاح کی علمی کاشوں کو منظر عام پر لانا ہے نیز طلبہ جدید کی تحریری صلاحیتوں کونشو ونما دینا ہے۔ چونکہ یہ رسالہ ملک کے ایک اہم دینی ادارے سے منسلک ہے لہذا ہم نے کوشش کی ہے کہ دیگر دینی تعلیمی اداروں سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالوں پر نظر ڈالی جائے اور ایک سرسری موازنہ قارئین کے سامنے آجائے۔فی الوقت دو اہم مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند سے نکلنے والا "ماہنامہ دارالعلوم"اور دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی وادبی ماہنامہ "معارف" پیش نظر ہے۔ان دو رسائل میں موجود عنوانات و مصنفین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی قدیم وجدید ہر دو پہلوؤں کا خیال رکھا گیا ہے، لیکن متذکرہ مدرسہ کے علاوہ دیگر فارغین مدارس اسلامیہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے ''حیات نو' میں صرف اور صرف فارغین فلاح کی تحریری صلاحیتوں کے فروغ پر توجہ مبذول ہے۔گفتگو کے پس منظر میں ہم بس یہی کہنا چاہیں گے کہ رسالہ کے مقاصد جو بھی رہے ہوں، اُن میں دو مقاصد اور شامل کیے جانے چاہیں:

۱) فارغین فلاح کی علمی وتحریری صلاحیتوں کونشو ونما دینے کے علاوہ رسالہ میں موجودہ حالات سے واقفیت، وسعت اور تنوع لایا جائے۔اور اس کے لیے اگر ضرورت ہو تو دیگر مدارس اسلامیہ کے مضامین کی اشاعت میں بخل سے کام نہ لیا جائے۔

۲) چونکہ رسالہ ماہانہ نہیں بلکہ سہ ماہی ہے اور وہ بھی اس دور میں جبکہ انٹرنیٹ کے ذریعہ طالب علم روزانہ بے شمار چیزوں کا مطالعہ کرتے نظر آرہے ہیں۔حیات نو ایک تحقیقی وتنقیدی رسالہ بن کر سامنے آئے۔اس کے لیے لازم ہوگا کہ ہر تین ماہ پر نکلنے والا رسالہ کسی مخصوص موضوع پر شائع کیا جائے۔

آخر میں بے شمار مبارک باد کے ساتھ، ڈگر سے ہٹ کر، صرف تعریف کے بجائے تأثرات میں چند مشورے صرف اس امید پر شامل کیے گئے ہیں، کہ اگر بات میں وزن محسوس کیا گیا تو تبدیلی بھی آئے گی۔تبدیلی کے نتیجہ میں نہ صرف رسالہ کا دائرہ وسیع ہوگا بلکہ اس کا وقار بھی بلند ہوگا (ان شاءاللہ)۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح

معمل اللغة کی جانب سے جامعہ میں طلبہ کا عربی زبان میں یک روزہ سیمینار

۱۸/اپریل ۲۰۱۵ء بروز شنبہ جامعہ میں معمل اللغۃ کی جانب سے ''أعلام الہند وجہودہم فی اثراء التراث الاسلامی'' کے موضوع پر ابو اللیث ہال میں عربی زبان میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ یہ سیمینار دو سیشن میں چلا۔ پہلے سیشن کی صدارت مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی کی۔ افتتاحی کلمات جناب مولانا محمد اکمل فلاحی صاحب نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ محنت اور جہد مسلسل کے ذریعے ہم اپنی شخصیت کو نکھار سکتے ہیں۔ آپ نے سیمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس سیمینار کا مقصد مختلف شخصیات کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے فائدہ اٹھائیں اور ہم بھی ان ہی جیسے بننے کی کوشش کریں۔ ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی نے اپنی گفتگو میں عربی زبان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ عربی زبان کے لیے چار چیزیں نہایت ہی ضروری ہیں: (۱) مہارۃ الاستماع، (۲) مہارۃ الکلام، (۳) مہارۃ القرأۃ، (۴) مہارۃ الکتابۃ۔ اخیر میں آپ نے فرمایا کہ عربی زبان بغیر مشق وممارست کے نہیں آتی، اس لیے عربی بولنے کی مشق کرنی چاہیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت مولانا انیس احمد فلاحی مدنی (صدر شعبہ اعلی) نے فرمائی۔

پہلے سیشن میں پیش کیے جانے والے مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

نمبر شمار	موضوع	مقالہ نگار	درجہ
۱	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	حبیب احسن	عربی ششم
۲	علامہ شبلی نعمانیؒ	عبدالرحیم	عربی ششم
۳	علامہ عبدالحمید فراہیؒ	عبیدالرحمٰن نوفل	عربی چہارم
۴	مولانا عبدالسلام ندویؒ	ارجمند قادر	عربی ششم

۵	شیخ محمد الیاس کاندھلویؒ	عباد الرحمٰن دہلوی	عربی چہارم
۶	امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ	فواز جاوید	عربی پنجم
۷	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	سرفراز احمد	عربی پنجم
۸	مفسر قرآن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ	عبید الرحمٰن طاہر	عربی ہشتم
۹	ڈاکٹر حمید اللہؒ	سجاد احمد خان	عربی ششم
۱۰	مولانا صدر الدین اصلاحیؒ	عبد المنعم ناصح	عربی چہارم
۱۱	مولانا افضل حسینؒ	عبد الرحمٰن سرور	عربی ششم
۱۲	محدث عبد الرحمٰن مبارکپوری	عامر جاوید	عربی ہفتم

دوسرے سیشن میں پیش کئے جانے والے مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

نمبر شمار	موضوع	مقالہ نگار	درجہ
۱	شاعر اسلام محمد اقبالؒ	لیث نواز	عربی چہارم
۲	مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ	سجاد احمد بیگ	عربی ششم
۳	مولانا عبد السلام ندویؒ	ابو سالم	عربی چہارم
۴	علامہ سید سلیمان ندویؒ	محمد عدنان	عربی ہشتم
۵	شیخ محمد الیاس کاندھلویؒ	محمد عرفان	عربی چہارم
۶	مولانا محمد علی جوہرؒ	شہاب ثاقب	عربی ہشتم
۷	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	نثار احمد	عربی چہارم
۸	مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی	نجم الحق	عربی ہفتم
۹	مولانا مسعود عالم ندویؒ	محمد ثاقب	عربی پنجم
۱۰	مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ	تنویر عالم	عربی ہفتم

سیمینار کے اختتام پر عمار احسن (عربی ہفتم)، فواز جاوید (عربی پنجم) اور مولانا ذکی الرحمٰن غازی (استاذ شعبہ اعلی) نے اپنے اپنے تأثرات پیش کئے۔

العربیہ للجمیع کی جانب سے جامعہ میں چھ روزہ ٹیچرس ٹریننگ ورکشاپ

۲۱/مارچ ۲۰۱۵ء بروز شنبہ تا ۲۶/مارچ بروز پنجشنبہ العربیہ للجمیع (ریاض سعودی عرب) کی جانب سے جامعہ میں ۶/روزہ ورکشاپ کا انعقاد دعوہ سینٹر کی عمارت میں ہوا۔ جس کا مقصد عربی زبان سیکھنے

سکھانے کے منہج، اسلوب اور طریقہ کار کی تربیت تھی۔ کیسے عربی زبان سیکھی اور سکھائی جائے، جدید تعلیم وتعلم کا طریقہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ العربیہ مجمع کی جانب سے ۲؍اساتذہ شیخ عبداللہ قحطانی اور شیخ علی شعوف پر مشتمل ایک وفد جامعہ تشریف لایا، اور مختلف موضوعات پر یہاں محاضرات پیش کئے، اس ورکشاپ میں نظری اور عملی دونوں لحاظ سے ٹریننگ کا اہتمام کیا گیا۔

اس پروگرام میں جامعہ کے دس شعبہ عربی کے اساتذہ اور ۹؍معلمات نے شرکت فرمائی، اس کے علاوہ جامعہ کی مختلف شاخوں جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں، جامعۃ الصلاح نصیر پور، جامعۃ الصالحات بانسی اور نیپال سے تقریبا دس اساتذہ نے شرکت فرمائی۔ افتتاحی سیشن میں مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مہتمم تعلیم وتربیت نے عربی زبان کی اہمیت وفضیلت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ ناظم جامعہ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ عربی زبان مشق اور ممارست سے آتی ہے، بغیر ممارست کے عربی زبان نہیں بولی جاسکتی۔ بہت سے ایسے علماء گزرے ہیں جنہوں نے تفاسیر اور دوسری کتابیں عربی زبان میں تصنیف کیں، لیکن ممارست نہ ہونے کے سبب عربی زبان نہیں بول سکتے۔ اختتامی سیشن میں مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی اور محترمہ سلمی سلامت اللہ فلاحی صاحبہ نے تأثرات پیش کئے۔

جامعہ میں محاضرات اور توسیعی لکچرس

۲؍مارچ ۲۰۱۵ء بروز دوشنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں معمل اللغۃ کی جانب سے مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب استاذ شعبہ اعلی کا ''دعوت دین اور اس کا طریقہ کار'' کے عنوان پر محاضرہ ہوا۔

۲۳؍مارچ بروز دوشنبہ جامعہ کی مسجد میں شیخ عبداللہ القحطانی (ریاض، سعودی عرب) کا ایک توسیعی لکچر ہوا، آپ کا موضوع تھا ''شباب الأمة الاسلامية''۔

۲۴؍مارچ ۲۰۱۵ء بروز سہ شنبہ جامعہ کی مسجد میں شیخ علی مشعوف (ریاض) کا ایک علمی محاضرہ بعد نماز مغرب رکھا گیا۔

جامعہ میں سالانہ امتحان کا آغاز اور تعطیل کلاں

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر میں اس مرتبہ تھوڑی سی تبدیلی کی گئی ہے، ۱۰؍مئی ۲۰۱۵ء بروز یکشنبہ تک تعلیم جاری رہے گی، اور ۱۴؍مئی بروز پنجشنبہ سالانہ امتحان کا آغاز ہوگا۔ ۲؍جون ۲۰۱۵ء بروز سہ شنبہ تک امتحانات جاری رہیں گے۔ اس کے بعد طلبہ اپنے اپنے گھروں کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ اعلان نتائج ۱۰؍جون بروز چہارشنبہ ہوگا، اور نیا تعلیمی سال ۲۸؍جولائی ۲۰۱۵ء بروز سہ شنبہ سے شروع ہوگا۔

جمعیۃ الطلبہ کے تعلیمی مظاہرے میں عبداللہ عزام کی شرکت

۵/اپریل ۲۰۱۵ء بروز یکشنبہ جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ تعلیمی مظاہرہ ہوا۔۱۰ بجے صبح پروگرام کے پہلے سیشن کا آغاز ابواللیث ہال میں ہوا، افتتاحی کلمات مولانا اعجاز قاسمی نے پیش کئے، تلاوت قرآن پاک، ترانہ جامعہ، نظم، اردو وعربی تقاریر کے بعد مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی کا خطاب ہوا۔ اس کے بعد طلبہ کے مابین ''غلبہ اسلام کے لیے مناسب مدارس یا یونیورسٹیاں'' کے عنوان پر ایک بہت ہی دلکش ڈبیٹ کا انعقاد کیا گیا، آخر میں مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی، مہتمم تعلیم وتربیت کا صدارتی خطاب ہوا۔ ظہر بعد جامعہ کی لائبریری میں نمائش کا افتتاح ہوا۔ دوسرا سیشن بعد نماز مغرب اور تیسرا سیشن بعد نماز عشاء حسن البنا ومودودی ہاسٹل کے سامنے والے پارک میں ہوا۔ دوسرے سیشن کے مہمان خصوصی عبداللہ عزام (صدر طلبہ یونین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وسی اے سی ممبر ایس آئی او آف انڈیا) تھے۔ پروگرام میں تلاوت، نظم، ترانہ جامعہ، ہندی وانگریزی تقاریر طلبہ نے پیش کیں۔ نائب ناظم جناب مولانا مقبول احمد فلاحی کے خطاب کے بعد مہمان خصوصی جناب عبداللہ عزام کا خطاب ہوا، انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، اس لیے ہم اپنے مقام ومرتبے کو پہچانیں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ صدارتی خطاب میں ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی نے طلبہ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ ملت کو آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، محنت ہی سے آپ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ تیسرے سیشن بعد نماز عشاء میں جمعیۃ الطلبہ کا تعارفی ویڈیو، ایکشن ترانہ، ڈرامہ، مکالمہ اسٹریٹ پلے، میڈیا ڈرامہ، مائم وغیرہ پیش کیا گیا، اور تمثیلی مشاعرہ بھی ہوا، پروگرام کافی دلکش تھا۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

ہر سال کی طرح اس سال بھی جامعہ میں جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے سالانہ مسابقوں کا انعقاد ہوا۔ عربی، اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں کے تحریری وتقریری مقابلے ہر کلاس کے حساب سے الگ الگ ہوئے، جس میں ثانوی، حفظ اور شعبہ اعلی کے طلبہ نے شرکت کی۔ اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا جائے گا۔ کھیل میں فٹ بال، والی بال اور بیڈمنٹن کا مقابلہ ہوا۔ بیڈمنٹن میں کل ۴۵/ٹیموں نے شرکت کی، کامیاب ہونے والی ٹیموں کو انعامات سے نوازا گیا۔ اسی طرح بیت بازی کا بھی مقابلہ عربی اول تا عربی سوم اور عربی چہارم تا عربی ہشتم الگ الگ منعقد ہوا، کامیاب ہونے والی ٹیموں کو انعامات سے نوازا گیا۔

انجمن طلبہ قدیم کا اجلاس عام

۱۲/اپریل ۲۰۱۵ء کو دہلی میں انجمن طلبہ قدیم کی رواں میقات کے اجلاس عام کے تعلق سے مجلس شوریٰ کا خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔شوریٰ کے اس اجلاس میں انجمن کے اجلاس عام کے تعلق سے درج ذیل فیصلے لیے گئے:

تاریخ اجلاس:

یہ اجلاس ۳۰/۳۱/اکتوبر و یکم نومبر ۲۰۱۵ء کو جامعۃ الفلاح میں ہوگا۔

اس اجلاس کو زیادہ سے زیادہ فلاحی رُخ دینے کی کوشش کی جائے گی، البتہ چند نمایاں شخصیات کو بھی مدعو کیا جائے گا۔

ناظم اجلاس:

مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی

معاونین:

مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی

برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی، دہلی

برادر عبید اللہ طاہر، جامعۃ الفلاح

ایگزیکیٹیو کمیٹی:

مولانا مقبول احمد فلاحی، جامعۃ الفلاح

جناب نعیم احمد غازی فلاحی، دہلی

ڈاکٹر ملک محمد فیصل فلاحی، لکھنؤ

ماسٹر کمال الدین فلاحی، جامعۃ الفلاح

پروگرام کمیٹی:

پروگرام کی تفصیلات اجلاس کمیٹی طے کرے گی، شوریٰ کے ذریعے تشکیل کردہ اجلاس کمیٹی درج

ذیل ہے:

(۱) جناب رضوان رفیقی فلاحی (صدر انجمن)

(۲) مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی (سکریٹری انجمن و ناظم اجلاس)

(۳) جناب نعیم غازی فلاحی (دہلی)

(۴) مولانا مقبول احمد فلاحی (جامعۃ الفلاح)

(۵) ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی (علی گڑھ)

(۶) مولانا انعام اللہ فلاحی (دہلی)

(۷) برادر ابوالاعلی سید سبحانی (دہلی)

شعبہ جات:

مختلف شعبہ جات کی تقسیم اور ان کے کنوینرس کا تقرر ناظم اجلاس اپنے معاونین اور ایگزیکیٹو کمیٹی کے مشورے سے کریں گے۔

نمائش:

اس موقع پر ایک فلاحی نمائش کا اہتمام کیا جائے گا، جس میں درج ذیل چیزیں شامل کی جائیں گی:

(۱) فلاحی برادران کی ڈائرکٹری تیار کی جائے گی۔

(۲) فلاحی برادران کی خدمات کے تعارف کے لیے چارٹ سازی کا اہتمام کیا جائے گا۔

(۳) مختلف فیلڈس (دینی وعصری) میں کام کرنے والے فارغین جامعہ کی نمایاں خدمات کا بہترین انداز میں تعارف کرایا جائے گا۔

(۴) جملہ فلاحی برادران کی مطبوعات (تصنیف، ترتیب، ادارت، ترجمہ وغیرہ) کو جمع کیا جائے گا۔

(۵) پی ایچ ڈی ہولڈرس فلاحی برادران کے پی ایچ ڈی مقالات کی بھی ایک ایک کاپی حاصل کی جائے گی۔

(۶) ایک فرد کا تقرر کیا جائے گا، جو جملہ فلاحی برادران کے فون نمبر، ای میل، موجودہ مصروفیات اور پوسٹل ایڈریس وغیرہ معلومات حاصل کرے گا۔

حیات نو سے متعلق:

اجلاس عام کی مناسبت سے حیات نو کی جانب سے درج ذیل چیزوں کا اہتمام کیا جائے گا:

(۱) حیات نو کا اب تک کا اشاریہ شائع کیا جائے گا۔
(۲) حیات نو کے خصوصی کالم ''فکر وآگہی'' کا مجموعہ شائع کیا جائے گا۔
(۳) اجلاس کے بعد حیات نو کا ''اجلاس نمبر'' شائع کیا جائے گا۔
(۴) حیات نو کی اب تک کی جملہ فائلیں اسکین کرا کر ان کی پی ڈی ایف فائلیں انجمن کی ویب سائٹ یا حیات نو کی ایک علیحدہ ویب سائٹ پر اپ لوڈ کرائی جائیں گی۔
(۵) اجلاس کے موقع پر حیات نو کا ایک علیحدہ اسٹال لگایا جائے گا، جس سے حیات نو کا تعارف اور مزید خریدار بنانے کا کام پیش نظر ہوگا۔

انجمن کی ویب سائٹ:

اجلاس سے قبل انجمن کی ویب سائٹ اپڈیٹ کرالی جائے گی، اور اس پر فلاحی برادران کا تعارف، ان کی خدمات اور جامعہ کے تعلق سے ضروری معلومات اپ لوڈ کی جائیں گی۔

اجلاس کی اطلاع:

مختلف ذرائع (اشتہارات، ای میل، سوشل میڈیا وغیرہ) سے اجلاس کی اطلاع ہر ہر فلاحی تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

ممبر سازی:

اجلاس سے قبل انجمن کے لیے مہماتی انداز میں ممبر سازی کی کوشش کی جائے گی، اور اجلاس کے اعلان اور ممبر سازی کے مقصد سے ایک ماہ تک لگاتار دعوت اخبار میں اشتہار شائع کرایا جائے گا۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح نیپال کی میٹنگ

مورخہ ۱۰/مارچ ۲۰۱۵ء جامعۃ الاصلاح الاسلامیہ بھوٹہا ضلع سنسری نیپال میں فلاحی برادران کی ایک نشست رکھی گئی۔ یہ نشست مولانا مقبول احمد فلاحی نائب ناظم جامعۃ الفلاح اور رحمت اللہ الاثری مہتمم تعلیم وتربیت جامعۃ الفلاح کی تشریف آوری کے موقع سے رکھی گئی تھی۔ مولانا مقبول احمد فلاحی نے اپنی تذکیر میں بتایا کہ جامعۃ الفلاح کا امتیاز ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو ایک واضح نصب العین کا شعور دیتا ہے تا کہ وہ کہیں بھی رہیں خدمت دین کا کام کریں اور اپنے نصب العین کو ہرگز نہ بھولیں۔ یہاں آپ دیگر فلاحی برادران کو اس نصب العین سے جوڑیے اور ان کو ضائع ہونے سے بچائیے۔ آپ نے مزید کہا: ''یہاں نیپال میں انجمن کے ذمہ داران سے درخواست ہے کہ نیپال میں موجود فلاحی بھائیوں کے

تعلق سے ایک ریکارڈ تیار کر کے جامعۃ الفلاح کے مرکزی دفتر کو ارسال کریں جس میں تفصیل ہو، کتنے فلاحی تصنیف وتالیف سے جڑے ہیں، کتنے فلاحی تدریس سے منسلک ہیں، کتنے فلاحی دعوتی میدان سے وابستہ ہیں، اس کے علاوہ اور کیا خدمات ہیں، کس کس میدان میں فلاحی کام کر رہے ہیں، تجارت میں کون کون ہیں، اور کس فن میں کس کو اختصاص حاصل ہے۔ اسی طرح فلاحی بہنوں کی یہاں اچھی تعداد ہے، ان کو بھی مجتمع کیجیے، ان کی صورت حال اور خدمات سے متعلق بھی معلومات فراہم کیجیے‘‘۔

اس کے بعد راقم الحروف سکریٹری انجمن سراج احمد برکت اللہ فلاحی نے انجمن کی مختصر رپورٹ پیش کی اور اس کی سرگرمیوں سے مہمانوں کو واقف کرایا۔ پھر نظر الحسن فلاحی امیر اسلامی سنگھ نیپال نے تفصیل سے فلاحی برادران کی خدمات کو بیان کیا۔ کئی ادارے ہیں جن کی قیادت فلاحی کر رہے ہیں، تدریس سے ایک بڑی تعداد وابستہ ہے، جماعت میں شروع سے فلاحی بھائی ہیں، تاسیسی اجلاس میں تین فلاحی شریک تھے۔ جماعت میں شروع سے کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ۶۵ ر فی صد ارکان فلاحی ہیں، قرآن مجید اور دیگر کئی کتابوں کا نیپالی میں ترجمہ کیا گیا ہے اور یہ کام ابھی جاری ہے۔

اس مجلس میں فلاحی بھائیوں نے ذمہ داران جامعہ کے سامنے یہ سوال رکھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ۲۰۰۰ء کے بعد فارغ ہونے والے فلاحی بھائیوں میں نہ تو صلاحیت ہوتی ہے، اور نہ تحریکی فکر ہوتی ہے، اور نہ ہی خدمت دین کا جذبہ ہوتا ہے، فلاح سے آنے کے بعد وہ گمنام ہو جاتے ہیں، خلیج چلے جاتے ہیں، اسلامی سنگھ نیپال سے وابستہ ہو کر کوئی کام کرنے کی رغبت نہیں رکھتے ہیں۔ اس تعلق سے گفتگو کے بعد یہ بات طے پائی کہ نیپال کے بھائی بڑی تعداد میں اب بھی طلبہ کو فلاح بھیجیں، ان کی تربیت پر بھی توجہ دیں، ماضی کی طرح دوبارہ تربیت اور فکر سازی کا سلسلہ شروع کریں، ذمہ داران جامعہ اس تعلق سے تعاون کرنے کو تیار ہیں، ۲۰۰۰ء کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس میں کمی وکوتاہی دونوں طرف سے ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

آخر میں مولانا رحمت اللہ الاثری صاحب کی تذکیر ہوئی۔ آپ نے فرمایا ہم فلاحی ہمیشہ اتحاد واتفاق کی بات کرتے ہیں۔ میرا سوال ہے کیا نیپال کے سارے فلاحی اپنے نصب العین کے لیے متحد ہیں، ہم کو سوچنا ہوگا، بسا اوقات بدگمانی، غلط فہمی اور دوری کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مل بیٹھ کر اسے دور کریں، شیطان تو ہمیشہ دو بھائیوں کے درمیان تفریق کرانے میں لگا ہوا ہے، وہ ایک کو دوسرے سے لڑاتا ہے اور ان کی قوت منتشر کر دیتا ہے۔

آخر میں صدر انجمن مولانا حسن حبیب فلاحی نے ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا اور اساتذہ کو یقین

دہانی کرائی کہ آپ نے جن امور کی جانب توجہ دلائی ہے ہم اسے ضرور پورا کریں گے، اور پھر فلاحی بھائیوں کو بتایا کہ انجمن دو مقاصد کے لیے قائم کی گئی ہے۔ آپ با مقصد بنیں، اپنے نصب العین کو یاد رکھیں، متحد اور منظم ہوکر اس نصب العین کے لیے کوشاں ہوں۔ دوسری بات یہ کہ جامعۃ الفلاح کی ترقی کے لیے فکر مند ہوں، ہر طرح کے مناسب اور مفید مشورے دیں، مالی تعاون دیں اور بالخصوص اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اس موقع سے فلاحی بھائیوں نے دل کھول کر جامعہ کے لیے مالی تعاون پیش کیا جو مولانا رحمت اللہ الاثری کے بدست جامعہ ارسال کیا گیا۔ (رپورٹ: سراج احمد برکت اللہ فلاحی، سکریٹری انجمن نیپال)

مدیر حیات نو کی آمد پر جامعہ شانتاپرم یونٹ کی نشست

مدیر حیات نو ابوالاعلیٰ سید سبحانی کی جامعہ اسلامیہ شانتاپرم آمد کے موقع پر یہاں موجود فلاحی برادران کی نشست رکھی گئی، جس میں تلاوت وتذکیر کے بعد انجمن کی رپورٹ پیش کی گئی۔ برادر ذوالقرنین حیدر سبحانی کے جامعۃ الامام سعودی عرب میں داخلے کے سبب سکریٹری یونٹ کی نشست خالی ہوگئی تھی، اسی مناسبت سے صدر یونٹ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فلاحی مدنی نے برادر سدید ازہر فلاحی کو اپنا سکریٹری مقرر فرمایا۔ اس موقع پر مدیر حیات نو نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جامعہ اسلامیہ شانتاپرم میں موجود مواقع، تحریک اسلامی ہند کی صورتحال، اور تحریک اسلامی نیز جامعۃ الفلاح کے تعلق سے شانتاپرم میں مقیم فارغین جامعہ کی ذمہ داریوں پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فلاحی کی دعا پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔

دعائے صحت کی درخواست

ہمارے ایک فلاحی ساتھی جناب محمد مبین فلاحی (ممبئی) اس وقت کافی علیل چل رہے ہیں، ادارہ حیات نو ان کے لیے خصوصاً اور تمام ہی مریضوں کے لیے دعائے صحت عاجلہ وکاملہ کی درخواست کرتا ہے۔